امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ

مغربی علوم وفنون کی تعلیم اردو زبان میں عثمانیہ یونیورسٹی کی ایک ایسی جاذب توجہ خصوصیت ہے کہ عموماً لوگوں میں اس کی شہرت جو کچھ بھی پہنچی وہ اسی حیثیت سے پہنچی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عہد عثمانی کے اولوالعزمانہ تجدیدی کارناموں میں یہ ایک ایسا بے نظیر کارنامہ ہے کہ آج ہندوستان ہی نہیں بلکہ مشرق چاہے تو اس پر فخر کرسکتا ہے۔ فنون عامہ وفلسفۂ تاریخ، معاشیات، عمرانیات وغیرہ اور علوم حکمیہ وطبعیات کیمیا، حیوانیات ونباتیات وغیرہ سب کی تعلیم کا ابتدائی درجوں سے ایم۔اے بلکہ ریسرچ (تحقیقاتی مدارج) تک اردو زبان میں کامیابی کے ساتھ منصۂ شہود پر لے آنا کوئی معمولی اقدام نہیں ہے۔ اس کے دوررس نتائج کا اندازہ ابھی آسان نہیں ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ بڑے رنج وافسوس کے ساتھ اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اردو اردو کے ہنگاموں میں عثمانیہ یونیورسٹی نہیں بلکہ ''الجامعۃ العثمانیہ'' کی جو سب سے بڑی خصوصیت ہے عموماً عوام کو اس کی خبر بالکل نہیں، میرا اشارہ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات کی طرف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ ہائے فنون وسائنس میں اس وقت جو تعلیم ہورہی ہے زبان کے امتیاز سے اگر قطع نظر کرلیا جائے تو بلاکم وکاست ظاہراً وباطناً صورۃً ومعناً یہ وہی تعلیم ہے جو آج ہندوستان کے ہر صوبہ بلکہ ایک ایک صوبہ کے مختلف جامعات میں مروج ہے۔

لیکن جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات میں اسلامی علوم (قرآن وحدیث، فقہ وکلام) کی تعلیم کا جو نیا قالب تیار کیا گیا ہے یعنی میٹرک تک طلبہ کو اسلامی علوم کے مضامین کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب اور تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، سائنس وغیرہ کا وہی نصاب پڑھایا جاتا ہے جو فنون وسائنس کے طلبہ پڑھتے ہیں اور انٹرمیڈیٹ سے ان کو اسلامی مضامین کے ساتھ ساتھ بی اے تک شعبۂ

فنون کے طلبہ کے ساتھ انگریزی ادب اور عربی ادب کا پڑھنا اور ان میں امتحان دینا ضروری ہے، بی اے کے بعد اسلامیات کے مضامین چار گانہ (تفسیر، حدیث، فقہ، کلام) میں سے کسی ایک مضمون میں ایم۔اے اور ایم۔اے کے بعد ڈاکٹریت کی ڈگری کے لیے ریسرچ کلاس (تحقیقاتی درجے) میں تعلیم حاصل کرنے کا باضابطہ نظم کیا گیا ہے۔حکومت نے پوری فیاضی کے ساتھ ہر قسم کی ضروریات ولوازم اساتذہ وطلبہ کے لیے فراہم کیے ہیں۔ظاہر ہے کہ جامعہ عثمانیہ کا یہ ایک ایسا امتیاز ہے کہ ہندوستان تو ہندوستان آج مصر وقسطنطنیہ، ایران وافغانستان جیسے اسلامی ممالک میں بھی اسلامی علوم کی تعلیم کا جہاں تک مجھے معلوم ہے، اس خاص عصری طرز نو کے ساتھ شاید انتظام نہیں کیا گیا ہے۔جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات میں اسلامی علوم کی تعلیم کس طریقے سے دی جاتی ہے اس کا ایک اجمالی اندازہ آپ کو اس مقالہ سے ہوسکتا ہے جو برہان میں شائع ہو رہا ہے۔جامعہ عثمانیہ کے امتحان میں ایم اے میں قاعدہ یہ ہے کہ منجملہ آٹھ پرچوں کے امتحان کا ایک پرچہ ''مقالہ'' کا ہوتا ہے۔جس مضمون میں امیدوار امتحان دینا چاہتا ہے اسی مضمون کے کسی عنوان پر ایک مقالہ بھی پیش کرنا ضروری ہے۔یہ مقالہ جامعہ کے اساتذہ کی نگرانی میں طلبہ تیار کرتے ہیں۔

''امام طحاوی'' کا یہ مقالہ جو اس وقت آپ کے سامنے پیش ہو رہا ہے، ایم اے کے ایک سابق طالب العلم عزیز محترم مولوی سید شاہ قطب الدین حسینی ایم اے سلمہ اللہ تعالیٰ نے خاکسار کی نگرانی میں مرتب کیا ہے۔جسے ۱۹۴۰ء کے امتحان میں انھوں نے پیش کیا تھا۔قطب میاں حیدرآباد کے ایک مشہور مشائخ خاندان کے چشم چراغ ہیں، ان کے اس مقالہ سے جہاں ان کی دماغی وذہنی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے اسی کے ساتھ ان لوگوں کو جو جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات اور اس کے خصوصیات سے ناواقف ہیں، اس کا بھی پتہ چلے گا کہ قدیم عربی مدارس میں اسلامی علوم کی تعلیم

جس نہج پر اس وقت تک جاری ہے، اس میں اور جس جدید تجربہ کی طرف جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات نے اقدام کیا ہے، دونوں میں کیا فرق ہے۔

آخر میں اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ مضمون پڑھنے والوں کو اس کا خیال بھی ضرور کرنا چاہیے کہ یہ ایک نومشق طالب العلم کی پہلی کوشش ہے جسے مدیر صاحب برہان کی فرمائش پر شائع کرنے جسارت کی جارہی ہے۔

خاکسار مناظر احسن گیلانی

(صدر شعبہ دینیات، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

⊙ ⊙ ⊙

میرے مقالہ کا عنوان امام ابوجعفر احمد بن محمد بن مسلمہ الازدی رحمۃ اللہ علیہ، اور فن حدیث کے متعلق ان کے خصوصی مجاہدات ونظریات ہیں۔ میں نے اپنے مضمون کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا ہے، پہلے حصہ میں امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ شخصی حالات درج ہوں گے اور دوسرے حصہ میں فنِ حدیث کے متعلق ان کے بعض خصوصی کارناموں کا تذکرہ کیا جائے گا۔

حصہ اوّل

نام ونسب:

امام طحاوی کا نام احمد ہے، والد کا نام محمد اور دادا کا نام مسلمہ تھا، کنیت ابوجعفر، نسبی نسبت الازدی الحجری اور وطنی الطحاوی ہے۔ سن ولادت باختلاف آراء ۲۲۹ھ تا ۲۳۸ھ او وفات بالاتفاق ۳۲۱ھ ہے۔ خاندانی طور پر یہ شافعی تھے، لیکن بعض واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے خاندانی مسلک کو ترک کر کے انھوں نے حنفی مذہب اختیار کر لیا اور زندگی کا بڑا حصہ حنفی مذہب کی حمایت میں گذرا۔ اس سلسلہ میں حدیث کے شعبہ ''متن'' کے مطالب بیان کرنے اور مختلف روایتوں میں تطبیق دینے میں خدا نے ان کو ایسا کمال عطا کیا، جس کی نظیر اسلام کی تاریخ میں بمشکل پیش کی جاسکتی ہے۔ اسی تخصیصی کارنامے کے سلسلہ میں ان کی سب سے پہلی تصنیف ''معانی الآثار'' اور سب سے آخری تصنیف ''مشکل الآثار'' ہے۔ درمیان میں مختلف علوم وفنون کے متعلق اور بھی ضخیم مجلدات میں انھوں نے اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں جن کا ذکر مناسب مقام پر کیا جائے گا۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ تو اجمالی تذکرہ تھا، اب میں انکے حالات پر ذرا تفصیلی طور پر کچھ بحث کرتا ہوں۔

الطحاوی دراصل طحا نامی مصر کے ایک گاؤں کی طرف نسبت ہے۔ السمعانی انساب میں طحا کے

متعلق لکھتے ہیں:

قرية بأسفل أرض مصر من الصعيد يعمل فيها الكيزان يقال لها الطحوية من طين أحمر.①

الصعید کے حصہ میں مصر کے نشیبی علاقہ کے ایک گاؤں کا نام ہے جہاں طحو یہ نامی کوزے سرخ مٹی سے بنائے جاتے ہیں۔

مصر کی علمی دوستی تاریخ کا ایک اجمالی تذکرہ:

واقعہ یہ ہے کہ اسلامی فتوحات کا دائرہ جب عہدِ فاروقی میں وسیع ہوا اور اتنا وسیع ہوا کہ چند ہی سالوں میں کسریٰ کے سارے مقبوضات اور قیصر کی حکومت کا ایک بڑا حصہ، مما لکِ محروسہ اسلامیہ میں داخل ہوگیا۔ قیصر ہی نگرانی میں اس وقت فرعون کی زمین مصر بھی تھی۔ حضرت عمرو بن العاص مشہور صحابی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مصر فتح ہوا اور مسلمان جوق در جوق اس ملک میں جا کر بسنے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام میں جتنے نفوس طیبہ نے اس ملک کو اپنا وطن بنایا۔ السیوطی نے اپنے مشہور رسالہ ''درالسحابہ'' میں ان کی تعداد تین سو بتائی ہے۔② اسی سے صحابیوں کی اولاد اور دوسرے مسلمانوں کا اندازہ ہوسکتا ہے، اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ عہد صحابہ میں جتنے مما لک فتح ہوئے ان میں اگر چہ چند علاقے ایسے تھے جہاں علم وتہذیب کی کافی روشنی پائی جاتی تھی لیکن اس اعتبار سے مصر کا درجہ سب سے بلند تھا۔ اسی ملک میں مسلمانوں کو اسکندریہ کے مشہور دارالعلوم اور اس کے متعلقہ اساتذہ وکتب خانوں کے دیکھنے، ان اساتذہ سے ملنے جلنے اور طور وطریقہ کے تجربہ کرنے کا موقع ملا۔ میری بحث بہت طویل ہوجائے گی اگر میں مصر کے قبل الاسلام علمی وتعلیمی حالات کی یہاں تفصیل کروں۔ بالفعل میرا صرف اتنا اشارہ ہی کافی ہے۔ مصر

---

① الانساب للسمعانی، الطحاوی، ج:۸، ص:۲۱۷۔

② درالسحابہ میں کل ۳۵۳ صحابہ وصحابیات کے اسماء منقول ہیں۔ حسن المحاضرۃ للسیوطی، ذکر من دخل مصر من الصحابۃ رضی اللہ عنہم ج:۱، ص:۱۶۶

کی اس علمی وتعلیمی خصوصیت کا اقتضاء تو یہ تھا کہ مسلمان علوم الاوائل ① کے مقابلہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے علوم جدیدہ کی ترتیب وتبویب، تصنیف وتالیف میں جب مشغول ہوئے تو اس کام کا سہرا مصر اور مصری علماء کے سر بندھتا، خصوصاً جب ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ صحابہ اور تابعین کی ایک بڑی تعداد مصر پہنچ کر وہاں توطن پذیر ہوگئی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما جو فقہاءِ مدینہ کے گویا امام ہیں، ان کے مشہور جانشین اور خلیفہ اور ان کے علم کے راوی حضرت نافع جن کا شمار سلسلۃ الذہب یعنی سنہری کڑیوں میں کیا جاتا ہے، محض تعلیم وتدریس کے لیے حضرت عمر ابن عبدالعزیز خلیفہ نے ان کا تقرر مصر میں کیا تھا۔ السیوطی لکھتے ہیں:

بعث عمر بن عبدالعزيز إلى مصر يعلمهم السنن فأقام بها مدة. ②	عمر بن عبدالعزیز نے ان کو مصر بھیجا تھا تا کہ لوگوں کو سنن کی تعلیم دیں۔ اسی لیے نافع وہاں (مصر) میں ایک مدت تک مقیم رہے۔

بہر حال نافع نے ایک مدت تک مصر میں اس علمی خدمت کو انجام دیا، اور ان کے حلقہ درس سے بعض ایسے علماء نکلے، جن کا شمار ائمہ مجتہدین میں کیا جا سکتا ہے۔ مثلا حضرت لیث ابن سعد المصری الامام جن کے متعلق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی جو امام مالک کے ارشد تلامذہ میں تھے لیکن اس

① تقدیری گردش کا ایک معمولی نمونہ علوم الاوائل کا لفظ ہے معنیٰ پرانے لوگوں کے علوم۔ مسلمانوں کو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ جدید علوم کا ایک نیا سرچشمہ ہاتھ آیا تھا تو جدید علوم کے اس حصہ کو دنیا کے دوسرے علوم جو اس زمانہ میں مروجہ تھے یعنی حساب، ریاضی، فلسفہ، ہیئت منطق وغیرہ کو علوم الاوائل کہتے تھے لیکن چرخ نیلوفری کی گردش نے آج ان ہی دماغی علوم کو علومِ جدیدہ کا خطاب عطا کیا ہے اور مسلمان جس علم کو جدید علم قرار دیتے تھے وہ تو خیر کیا باقی رہتا؟ آہ! اکثروں کی نگاہوں میں وہ علم کہلانے کا بھی مستحق نہیں۔ آج جامعہ عثمانیہ کے سوا ہندوستان کی عام تعلیم گاہوں سے قرآن وحدیث، فقہ کلام کی تعلیم کو شہر بدر جو کیا گیا ہے آخر اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ ان علوم کو علم ماننے کے لیے زمانہ تھا۔

② حسن المحاضرہ للسیوطی، ذکر من کان بمصر من الائمۃ المجتہدین؛ رقم الترجمۃ: ۱۷، ج: ۱، ص: ۲۵۸۔

کے باوجود لیث بن سعد کے متعلق ان کی منصفانہ رائے یہ تھی کہ:

كان الليث أفقه من مالك إلا أنه ضيعه أصحابه. ①

لیث حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ فقیہ تھے لیکن لیث کو ان کے شاگردوں نے ضائع کر دیا۔

اس علمی جلالتِ قدر کے ساتھ لیث مصر کے دولت مندوں میں بھی امتیاز رکھتے تھے وہ ایک خاندانی جاگیردار یا زمیندار رئیس تھے، ان کی آمدنی تقریباً کئی لاکھ روپیہ سالانہ سے متجاوز تھی، علم وامارت دونوں قوتوں نے مصر میں اِن کے اقتدار کو اتنا مستحکم کر دیا تھا کہ گو حکومت کے کسی عہدہ پر سرفراز نہ تھے تاہم،

كان نائب مصر و قاضيها من تحت اوامر الليث و كان اذا رابه من احد شئ كاتب فيه فيعزله و قد اراده المنصور ان يوليه امرة مصر فامتنع ②

مصر کا نائب خلیفہ (گورنر) اور مصر کا قاضی ہمیشہ لیث کے احکام کا تابع رہتا تھا۔ لیث کو کسی کا طرزِ عمل جب شک میں مبتلا کرتا تو (مرکز) کو لکھتے اور اِس کو معزول کرا دیتے۔ خلیفہ منصور نے چاہا کہ مصر کی گورنری اِن کے سپرد کر دے لیکن انہوں نے انکار کیا۔

علم کی خدمات کے سلسلہ میں اِن کے کارنامے مشہور ہیں۔ تاریخ کی اکثر کتابوں میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ان کے دوامی حسنِ سلوک کے واقعات درج ہیں ③۔ خطیب نے لکھا

---

① حسن المحاضرہ للسیوطی، ذکر من کان بمصر من الائمۃ المجتہدین؛ رقم الترجمۃ: ۳۲، ج: ۱، ص: ۲۶۲۔

② حسن المحاضرہ للسیوطی، ذکر من کان بمصر من الائمۃ المجتہدین؛ رقم الترجمۃ: ۳۲، ج: ۱، ص: ۲۶۲۔

③ کہا جاتا ہے کہ امام مالک نے لیث کی خدمت میں ایک ''صینیہ'' (سینی) بھر کر کھجوریں تحفہ میں بھیجیں لیث نے طلائی اشرفیوں سے بھر کر اس صینیہ کو واپس کیا۔ (وأن الإمام مالكا أهدى إليه صينية فيها تمر، فأعادها مملوءة ذهبا)۔ وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۵۴۹، ج: ۲، ص: ۲۹۶۔

ہے کہ اپنے حلقۂ دروس کے طلبہ کے زیادہ تر مصارف کا انتظام یہ خود اپنی ذاتی آمدنی سے کرتے تھے۔ اِن کی فراخ چشمی اور ذوقِ علم کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ موسم سرما میں طلبہ کو جو ناشتہ اِن کے یہاں سے ملتا تھا اِس میں علاوہ دوسری چیزوں کے بھنے ہوئے بادام کا ستو بھی ہوتا تھا۔

اِن لوگوں کے لیے جو مدعی ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے سارے علوم دوسری قوموں کے نقشِ قدم پر چل کر اور اِن ہی کو دیکھ دیکھ کر مدون کیے ہیں یہ واقعہ قابلِ غور ہے کہ مصر ہی اِس زمانے میں مشرقِ قریب کا سب سے بڑا علمی مرکز تھا۔ مسلمانوں کو یہاں رہنے سہنے کا بھی موقع ملا اور بڑے بڑے اہلِ علم نے یہاں اسلامی علوم کی خدمت بھی کی، لیکن باوجود اِس کے اسلامی علوم یعنی قرآن وحدیث، فقہ میں سے کسی علم کے متعلق مصر کو سبقت حاصل نہ ہوسکی۔ باوجود اتنے ساز و سامان کے وہ ان علوم میں مدت تک اسلام کے دوسرے علمی مرکزوں کا دستِ نگر بلکہ ماتحت رہا۔ مصر والوں کا اسلامی علوم کے متعلق جو حال رہا اِس کا اندازہ اِسی واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ بیچارے لیث بن سعد نے مختلف علمی مرکزوں میں گھوم پھر کر بڑی محنت سے زہری، عطا بن ابی رباح وغیرہ جیسے جلیل القدر تابعین کے علوم کو حاصل کیا اور خود مصر میں بھی نافع مولی ابن عمر سے ان کو بہت کچھ ذخیرہ ہاتھ آیا۔ لیث نے اس کے بعد جیسا کہ میں نے عرض کیا اپنی ساری مالی قوت اشاعت علم میں صرف کر دی، لیکن پھر بھی امام شافعی کی شہادت ہے کہ ان کے شاگردوں میں کوئی اس قابل تو کیا ہوتا کہ خود کچھ کرتا دھرتا اتنا بھی ان لوگوں سے نہ ہوسکا کہ لیث کے سرمایہ ہی کو برباد ہونے سے بچا لیتے۔

مگر اس کے مقابلہ میں اسلامی قوانین و مسائل کی بنیاد کہاں پڑتی ہے، ٹھیک اسی جگہ جو بالکل مسلمانوں کی اپنی بنائی ہوئی خاص نو آبادی تھی یعنی کوفہ جس میں زیادہ تر آنحضرت ﷺ کے

اصحاب یا عرب کے مختلف قبائل کے فوجی سپاہی تھے یعنی کل کے کل ان ہی لوگوں سے کوفہ آباد ہوا تھا جنہیں غیر اقوام کے اہلِ علم سے تو خیر، شاید عوام سے بھی زیادہ ملنے جلنے کا کم ہی اتفاق ہوتا تھا اور کوفہ کے ساتھ ساتھ دوسرا مقام جہاں ہم اسلامی علوم کی گرم بازاری محسوس کرتے ہیں وہ مدینہ منورہ ہے یعنی ان ہی دونوں شہروں میں تقریباً ایک ہی زمانہ میں فقہ حنفی اور فقہ مالکی کی تدوین کا کام شروع ہوا، مدینہ میں بھی یہ کام اس وقت شروع ہوا، جب پائے تخت وہاں سے منتقل ہو کر دمشق اور بغداد چلا گیا۔ یونہی عرب میں غیر اقوام کے لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ کم تھا پھر جب مدینہ منورہ نے بجائے سیاسی مرکز ہونے کے مسلمانوں کا صرف ایک مذہبی اور دینی مرکز ہونے کی حیثیت اختیار کر لی تو اس وقت مسلمانوں کے سوا غیر قوموں کے افراد کو اس سے کیا دلچسپی باقی رہ سکتی تھی۔ یہ خدا ساز بات تھی کہ مسلمانوں کی محنتوں اور جانفشانیوں پر خاک ڈالنے کے لیے جو یہ مفروضہ گھڑا جانے والا تھا کہ ارسطو کے ان قلیوں نے علوم الاوائل اور فنون پارینہ ہی کے متعلق نہیں بلکہ اپنے علوم وفنون میں بھی انہوں نے دوسروں کی صرف نقل اتاری ہے حتیٰ کہ اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا قانون رومن لاء اور دستور ایران کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے لیکن تراشنے والوں نے کبھی یہ بھی سوچا کہ اگر یہی واقعہ ہوتا تو اسلامی قانون کی تدوین کی ابتداء بجائے کوفہ اور مدینہ منورہ کے اسکندریہ اور فسطاط یا مدائن اور بغداد میں ہوتی۔ کچھ نہیں تو صرف ایک یہی تاریخی حقیقت ان ہرزہ سرائیوں کی تردید کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔ خیر یہ تو ایک تمہیدی ضمنی بات تھی میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ گو مصر اس عہد میں اگر ساری دنیا کا نہیں تو کم از کم افریقہ و یورپ اور ایشیاء کے ان علاقوں کا جنہیں موجودہ زمانہ میں مشرقِ قریب کے نام سے موسوم کرتے ہیں، تمام علوم قدیمہ کا سب سے بڑا مرکز تھا لیکن خود اس سرزمین میں مسلمانوں کے علوم جدیدہ کے متعلق کوئی قابل ذکر کام ایک مدت تک انجام نہ پا سکا۔ لیث بن سعد نے کوشش بھی کی، لیکن کوشش بار

آ ور نہ ہوئی، یہی وجہ ہے کہ مصر دوسروں کی تو کیا رہنمائی کرتا خود اپنی رہنمائی میں بھی ہمیشہ باہر کے علماء کی آراء کا محتاج رہا۔ حالانکہ مصر کے سوا ابتدائی صدیوں میں اسلام کے تمام مرکزی مقامات کے مسلمان عموماً خود اپنے قطر کے امام ہی کی پیروی کرتے تھے، مدینہ منورہ، مکہ معظّمہ، کوفہ، بصرہ، شام سب کا یہی حال تھا۔ ان سب کے مقابلہ میں بیچارہ اسکندریہ کے دارالعلوموں اور کتب خانوں والا ملک ایسا بدقسمت ملک تھا جو عموماً کسی بیرونی عالم کے اتباع پر مجبور تھا۔ ابتداء اس ملک پر شام کے امام اوزاعی اور مدینہ منورہ کے امام حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا اثر رہا، لیکن اب وہب، ابن قاسم، ابن الفرات، اشہب، عبداللہ بن الحکم، اصبغ، مالکی مذہب کے ان علماء کا جن میں بعض امام مالک کے براہ راست شاگرد تھے اور بعض بالواسطہ۔ ان لوگوں نے اس ملک پر اپنے علم وفضل کا ایسا سکہ قائم کیا کہ مدت تک یہاں پھر کسی دوسرے ائمہ کے خیالات کی اشاعت نہ ہوسکی۔

کہتے ہیں کہ سب سے پہلے حنفی فقیہ جو اس ملک میں قاضی بن کر داخل ہوئے وہ اسمٰعیل بن سمیع الکوفی السابری تھے جو باوجودیکہ بخاری ومسلم کے رواۃ میں ہیں ① لیکن چونکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فتویٰ پر عمل کرتے تھے اور مصر میں اس زمانہ تک لوگ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے مسلک سے ناواقف تھے۔ اس بناء پر مصری ان سے سخت ناراض ہوئے، بالآخر حکومت جس کا پائے تخت اس وقت بغداد منتقل ہو چکا تھا۔ اس کو لیث بن سعد کے توسط سے مجبور کیا گیا کہ اس حنفی قاضی کو مصر سے واپس بلا لیا جائے۔ لیث نے اس سلسلہ میں جو مراسلہ بھیجا تھا، السیوطی نے بجنسہٖ اسے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔

---

① یہ مسلم کے رواۃ میں سے ہیں بخاری نے ان سے روایت نہیں کی۔ (برہان)

؎ حسن المحاضرۃ میں ان کا نام اسماعیل بن الیسع منقول ہے۔ (زاہد)

يا أمير المؤمنين إنك وليتنا رجلا يكيد سنة رسول الله صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بين أظهرنا.

اے مسلمانوں کے امیر! تم نے ہم پر ایسے آدمی کو نگراں مقرر کیا ہے جو رسول اللہ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی سنت کے ساتھ بھی لوگوں کے سامنے چال چلتا ہے۔

لیکن اس شکایت کے ساتھ خط کے آخر میں اس کی شہادت ادا کی گئی تھی کہ:

ما علمنا في الدنيا رو الدراهم الا خيرا.①

یعنی رشوت کے لین دین سے ان دامن پاک ہے۔

بہرحال جہاں تک مجھے معلوم ہ اسمٰعیل بن سمیع مصر کے پہلے حنفی عالم ہیں جنہیں امام لیث کی تحریک سے عہدۂ قضا سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس موقع پر ابن خلکان کا یہ بیان قابلِ ذکر ہے۔

رايت في بعض المجاميع ان الليث كا حنفي المذهب۔ ②

بعض (مجامیع) میں میں نے دیکھا کہ لیث حنفی المذہب تھے۔

مذکورہ بالا مکتوب اگر صحیح ہے تو لیث کا حنفی المذہب ہونا عجیب ہے۔ والدهر آت بالأعاجيب.

خیر یہ ایک تاریخ مسئلہ ہے جس کی تحقیق اپنے مقام پر ہونی چاہیے۔ قاضی اسماعیل کے چلے جانے کے بعد پھر مصر میں وہی مالکیوں کا زور قائم رہا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہم جس زمانہ کے حالات بیان کر رہے ہیں، یہ اسلامی حکومت کے شباب کا عہد تھا۔ مسلمانوں کے پاس اگرچہ قرآن وحدیث اور آثار صحابہ کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا لیکن آئے دن بکثرت ایسے حوادث وواقعات پیش آتے رہتے تھے جن کے لیے ہر دن ایک نئے فقہی جزئیہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ مشہور ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے اسی ضرورت نے ہر ملک میں ایک ایسے گروہ کو پیدا کر دیا تھا، جو ان پیش آنے والے حوادث کے متعلق قرآن وحدیث وآثار صحابہ کو پیش نظر رکھ کر قوانین پیدا کرتا

① حسن المحاضرۃ للسیوطی، ذکر قضاۃ مصر، ج:۲، ص:۱۳۷۔

② وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ:۵۴۹، ج:۲، ص:۲۹۶۔

رہتا تھا، ابتداء میں تو یہی تین چیزیں اساس اور اصول کی حیثیت سے استعمال کی جاتی تھیں لیکن جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا جاتا تھا، ان فقہاء کے مجتہدات بھی ان کے مکتب خیال کے ماننے والے علماء اور ان کے تلامذہ میں ایک اساسی اصول کا درجہ حاصل کرتے جاتے تھے، یوں ہی ہر مقدم کے اقوال ونظریات متأخر کے لیے حجت بن جاتے تھے، اور ان تفریعات سے تفریعات، تفریعات سے استخراجات کا سلسلہ اس طرح جاری ہو جاتا تھا بلکہ اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا مصر دوسری صدی میں مالکی علماء کے ممتاز افراد کا ایک مرکزی مقام بنا ہوا تھا۔ چند ہی دنوں میں ابن قاسم، اشہب، عبداللہ بن الحکم، جیسے جلیل القدر ائمہ جن میں بعض ایک دوسرے کے معاصر تھے اس ملک میں پیدا ہوئے، ان میں اکثر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ تھے یا ان کے شاگردوں کے شاگرد تھے، ان میں سے ہر ایک نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مجتہدات و استنباطی مسائل وتفریعات کے ساتھ ساتھ خود بھی زندگی کے ہر شعبہ میں جزئیات کا ایک بحر بیکراں پیدا کر دیا تھا، نتیجہ یہ ہوا جیسا کہ ہمیشہ ایسے موقع میں ہوتا ہے کہ قرآن اور حدیث وآثار صحابہ جو اسلامی قوانین کے حقیقی منابع اور سرچشمے ہیں، ان سے لوگوں کی توجہ بتدریج ہٹتی رہی اور اب قال ابن قاسم، قال اشہب، الیہ ذہب سحنون، بہ اخذ اصبغ، یہی علم رہ گیا اور ان ہی کے اقوال سے جزئیات کا پیدا کرنا اجتہاد قرار پایا، مالکیوں کے مذکورہ بالا علماء میں سے تقریباً سب ہی اصحاب تصنیف وتالیف ہیں اور ہر ایک کے تصنیفی ذخیروں کی تعداد ہزارہا صفحات سے متجاوز تھی جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے ① صرف ابن قاسم کی مدونہ جو مطبوعہ ہو چکی ہے، ان لوگوں

---

① ان مالکی علماء کی مشہور کتب میں ابن القاسم کی مدونہ، مجالس ابن القاسم التی سأل عنہا مالکا، اسی طرح سحنون کی مدونہ جو انہوں نے ابن القاسم سے روایت کی۔ (زاہد)

کے تصنیفی ذوق وشوق کے اندازہ کے لیے کافی ہے حالانکہ ان میں زیادہ تر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ہی کے اجتہادات درج کیے گئے تھے۔ ملک کی ضرورت کے سوا ایک اور چیز بھی تھی جوان بزرگوں کو نئی نئی موشگافیوں پر آمادہ کرتی تھی، وہ علم کی وہی خصوصیت ہے جس سے اہل علم کا شاید ہی کوئی طبقہ کسی زمانہ میں محفوظ رہا ہو۔

امام اشہب اور امام ابن قاسم دونوں کا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد ترین تلامذہ میں شمار ہے۔ تقویٰ وطہارت، زہد وعبادت میں ہر ایک بلند مقامات کا مالک تھا لیکن ابن خلکان نے لکھا ہے کہ دونوں میں مقابلہ رہتا تھا۔① ان علمی رقابتوں اور معاصرانہ چشمکوں کا یہی نتیجہ تھا کہ ہر ایک اپنے حلقہ ہائے درس میں نئے نئے پیچیدہ سوالات پیدا کرتا اور شاگردوں کو حکم دیتا کہ ذرا ان کے جوابات ان دوسرے عالم صاحب سے تو پوچھ کر آؤ، یا خود بخود لوگ ان سوالات کو دوسرے علماء تک پہنچاتے۔ اختلاف طبائع، معلومات اور دوسرے اسباب کی بنا پر بسا اوقات جوابات مختلف ہوتے اور بالآخر یہی اختلاف مباحث کے ایک طویل سلسلہ کا سبب بن جاتا۔

بہر حال مصر بھی اسی حال میں مبتلا تھا، ہر طرف فقہ مالکی کے ماہرین پھیلے ہوئے تھے اور ان کا زیادہ وقت ان ہی فقہی جزئیات اور تفریعات کے حل کرنے میں بسر ہو رہا تھا کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں حق تعالیٰ نے سرزمین حجاز مین ایک نئے دل ودماغ کے آدمی کو علمی بلندی عطا کی یوں تو اسلامی ممالک کا گوشہ گوشہ اہل علم سے بھرا ہوا تھا لیکن اس نوجواب عالم کو علاوہ دماغی اور ذہنی خصوصیتوں کے ایک قدرتی خصوصیت یہ حاسل تھی کہ ان کا نسبی تعلق قبیلۂ قریش اور قریش میں بھی اس خانوادہ سے تھا جس کا سلسلہ کئی پشتوں کے بعد سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا تھا۔ میری مراد حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے جن کا پورا نام ابوعبداللہ محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن

① وفیات الاعیان لابن خلکان، اشہب تلمیذ مالک، رقم الترجمۃ: ۱۰۰، ج: ۱، ص: ۱۲۷۔

شافع بن السائب بن عبید بن عبد یزید بن ہاشم بن عبدالمطلب بن عبد مناف ہے، یعنی دسویں پشت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا نسب متصل ہو جاتا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہاں پیدا ہوئے، اس میں تو بہت کچھ اختلاف ہے۔ عموماً غزہ (فلسطین) کو ترجیح دی جاتی ہے تاہم اتنا یقینی ہے کہ دو ہی سال کی عمر میں وہ مکہ پہنچا دیئے گئے۔ یہیں قرآن یاد کیا اور بالآخر تحصیل علم کے لیے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور ایک زمانہ ان کی خدمت میں گذارا۔ طالب علم کی یہ پہلی مثال تھی پڑھنے سے پہلے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک کی کتاب موطا زبانی یاد کر لی تھی۔ جب پڑھنے کے لیے امام مالک کے پاس حاضر ہوئے انہوں نے کتاب کھولنے کا حکم دیا، بولے زبانی سناتا ہوں، کہا جاتا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس رنگ کو دیکھ کر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اسی وقت بھانپ لیا کہ یہ لڑکا کچھ ہونے والا ہے۔ بولے:

إن يك أحد يفلح فهذا الغلام.① اگر کوئی کامیاب ہوسکتا ہے تو یہ وہی لڑکا ہے۔

یہاں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ دوسرے علماء فقہ وحدیث کے درس میں بھی حاضر ہوتے رہے، بالآخر استاذ (امام مالک رحمۃ اللہ علیہ) کی وفات کے پندرہ سولہ سال بعد یہ مستقل طور پر قیام کرنے اور اپنا خاص نقطہ نظر جو اس عرصہ میں مختلف اساتذہ اور ملک کے عام حالات کے دیکھنے سے ان میں پیدا ہوا تھا اس کی اشاعت کے لیے اسلامی پائے تخت بغداد پہنچے۔ بغداد میں اس وقت حنفی فقہاء کا طوطی بول رہا تھا کیونکہ یہ وہی زمانہ ہے جب ہارون الرشید نے قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو محکمہ عدالت کے کلی اختیارات اس طور پر سپرد کر دیئے تھے کہ ممالک محروسہ میں کسی قاضی کا تقرر بغیر ان کی مرضی اور حکم کے نہیں ہوسکتا تھا۔ علامہ تیمور پاشا مصری لکھتے ہیں:

---

① وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۵۵۸، الامام الشافعی، ج: ۲، ص: ۳۱۲۔

لما قام هارون الرشيد في الخلافة ولى القضاء إلى أبي يوسف صاحب أبي حنيفة بعد سنة سبعين ومائة فأصبحت تولية القضاء بيده فلم يكن يولى ببلاد العراق و خراسان و الشام و مصر الى اقصى عمل أفريقية إلا من أشار به.①

جب خلافت کے منصب پر ہارون پہنچا تو اس نے قضاء کا کام ابو یوسف کو جو ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، سپرد کر دیا یعنی ۱۷۰ھ میں یہ سپردگی عمل میں آئی۔ اس کے بعد قاضیوں کے مقرر کرنے کا اختیار امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ میں آ گیا۔ عراق، خراسان، شام مصر اور افریقہ کی آخری حدود تک جہاں تک عباسیوں کی حکومت تھی، ان ممالک میں ہارون کسی کو قاضی مقرر نہیں کرتا تھا لیکن صرف اسی کو جس کے متعلق ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اشارہ کرتے۔

اس کے بعد ظاہر ہے عباسی حکومت کے تمام عدالتی محکموں پر حنفی فقہاء کا تسلط ایک قدرتی بات تھی اور یہ تو فقہ کا حال تھا۔ باقی پھر علم حدیث تو بغداد اس زمانہ میں بڑے بڑے ممتاز محدثین مثلاً امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین جیسے بزرگ سے معمور تھا۔ کہا جاتا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا نقطۂ نظر جب بغداد میں پیش کیا تو اور تو اور حدیث کے سب سے بڑے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ابتداءً ان کا طریقہ پسند نہ آیا۔ ابن خلکان نے یحییٰ بن معین کا قول نقل کیا ہے۔

كان أحمد بن حنبل ينهانا عن الشافعي.②

احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ہم لوگوں کو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آنے جانے سے منع کرتے تھے۔

اسی لیے دو سال قیام کرنے بعد پھر مکہ معظّمہ واپس ہو گئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے لیے انہوں نے وہاں کوئی گنجائش نہ پائی لیکن اصلاح کا جو جذبہ ان میں متلاطم تھا اس نے پھر دوبارہ قسمت

① نظرۃ التاریخیۃ فی حدوث المذاہب الفقہیۃ الاربعۃ لاحمد تیمور پاشا، باب؛ ایثار الحنفیۃ بالقضاء، ج:۱، ص:۵۱۔
② وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ ۵۵۸، الامام الشافعی، ج:۲، ص:۳۱۲

آزمائی پر آمادہ کیا اور پھر بغداد آئے۔ اس مرتبہ انہوں نے اپنے خیالات کو کتاب کی شکل میں قلم بند کرنا شروع کیا۔ خیال گزرتا ہے کہ تحریر کے ذریعہ سے اپنے منشاء کی تعبیر میں وہ کامیاب ہوئے، حتیٰ کہ خود امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کے انتہائی نیازمندوں میں شامل ہوگئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ احترام کی آخری شکل یہ تھی کہ بغداد کی سڑکوں پر علانیہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے خچر کے پیچھے پیچھے تشریف لے جاتے تھے، مگر بغداد کا میدان ان کو پھر بھی تنگ نظر آیا اور وہ کسی ایسے مرکز کی تلاش میں تھے، جہاں اب تک اسلامی علوم پر مجتہدانہ کام نہ ہوا تھا۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلامی ممالک میں یہ خصوصیت صرف مصر کو حاصل تھی اب تک وہ بیرونی علماء کا دینی اور قانونی زندگی میں دست نگر تھا۔ امام کی عمر اس وقت جب مصر کی طرف روانہ ہوئے، کل ۳۸ سال کی تھی گویا اسی سرزمین کے لیے خدا نے ان کو پیدا کیا تھا، مسلسل ۲۰ سال تک اس ملک میں وہ اپنے خصوصی نظریات اور مجتہدات کی اشاعت درساً وتصنیفاً فرماتے رہے اور مصر ہی کی سرزمین میں بالآخر آسودہ ہوئے۔①

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا خاص نقطہ نظر کیا تھا؟ اسکا جواب اتنا آسان نہیں ہے کہ کسی مختصر مقالہ کے تمہیدی بیان میں اس کی تفصیل کی جائے، تاہم جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ مصر ہو یا بغداد، مدینہ منورہ ہو یا مکہ، ان تمام مرکزی مقامات میں دو ہی قسم کے علمی حلقے پائے جاتے تھے۔ ایک حلقہ فقہاء کا تھا اور انہی کا اثر ملک اور حکومت پر زیادہ تھا کیونکہ دینی زندگی کے لیے عوام کو اور قانونی ضرورتوں

① امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر وفات کے وقت کل چون سال کی تھی، ۱۵۰ ہجری آپ کی ولادت عمل میں آئی اور ۲۰۴ ہجری میں وفات واقع ہوگئی۔ اس لحاظ سے ۳۸ سال کی عمر میں مصر میں آنا اور بیس سال تک داد تحقیق دیتے رہنا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے۔ مصر میں امام شافعی کا ورود ۱۹۹ ہجری کے آخر میں ہوا ہے۔ اس وقت امام کی عمر ۴۹ برس کی تھی۔ یہیں امام نے پانچ سال کی مدت میں کتبِ جدیدہ کی تصنیف کا کام انجام دیکر داعی اجل کو لبیک کہا۔ ملاحظہ ہو تہذیب الاسماء واللغات لامام نووی، رحلۃ للمدینۃ واخذہ العلم عن مالک، ج:۱، ص:۴۷۔ (برہان)

کے لیے حکومت کو ان ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا اور ان کا مشغلہ یہی تھا کہ اپنے اپنے اساتذہ اور ائمہ کے اقوال کو اصل قرار دے کر نئے حوادث وواقعات کے متعلق جزئیات پر جزئیات نکالتے چلے جاتے تھے۔ ہر پچھلا اپنے پہلوں کے قول کو بطور حجت اور دلیل کے استعمال کر رہا تھا اور دوسرا طبقہ محدثین کا تھا جو سندوں کے ذریعہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ وتابعین کے اقوال وافعال نقل کیا کرتا تھا، ان کی توجہ متن سے زیادہ اسناد کی طرف مبذول رہتی تھی۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ جیسے محدثین خود کہا کرتے تھے۔

إنا لسنا بالفقهاء ولكنا سمعنا الحديث فهو يناه للفقهاء. ①

ہم لوگ فقہاء نہیں ہیں بلکہ ہماری حیثیت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہم سنتے رہتے ہیں پھر فقہاء کے سامنے ان ہی حدیثوں کو روایت کر دیتے ہیں۔

گو ان بزرگوں کا احترام ملک میں سب ہی کرتے تھے لیکن نہ پبلک کی کوئی ضرورت براہ راست ان سے وابستہ تھی اور نہ حکومت کی غرض، یہی حال تھا جس میں امام شافعی نے اسلامی ممالک کو پایا، ان کو خدا نے حدیث کے ذخیروں کے حاصل کرنے کا بھی کافی موقع دیا تھا اور فقہاء کے حلقوں میں بھی انھوں نے اپنی عمر کا ایک حصہ گذارا تھا۔ فقہاء کا قرآن وحدیث سے عملاً بے توجہ ہو کر صرف اپنے اساتذہ اور ائمہ کے اقوال میں ہمہ تن غرق ہو جانا اور محدثین کا حدیثوں کے متن سے بے پروا ہو کر صرف سند کے قصوں میں الجھے رہنا یہ دونوں باتیں ان کو ناپسند ہوئیں انہوں نے ایک نئی راہ یہ نکالی کہ حوادث وواقعات کے سلسلہ میں بجائے اپنے استادوں کے اقوال کے کیوں نہیں براہ راست قرآن وحدیث ہی کے متون میں غور کر کے نتیجہ حاصل کیا جائے۔

ظاہر ہے بیشمار جزئیات ولامحدود مسائل میں سے ہر ایک مسئلہ کے لیے قرآن کی آیت یا صحیح

① تذکرۃ الحفاظ للذہبی، ابوعمرو الشعبی، ج:۱، ص:۸۵۔

حدیث پیش کرنے کی کوشش کرنا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن امام نے کمرِ ہمت چست کی اور جہاں تک ممکن ہوسکا قرآنی آیات اور حدیث کے ذخیروں سے نفع اٹھانا شروع کیا۔① ان کے اس طرزِ عمل نے سب سے پہلا انقلابی اثر جو پیدا کیا وہ یہ تھا کہ بیچارے محدثین جواب تک ملک میں صرف ایک مقدس تبرک کی حیثیت رکھتے تھے اچانک ان کا علم کارآمد اور نتیجہ خیز ہوگیا۔ اسی لیے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں کا خلاصہ امام زغفرانی نے یہ بیان کیا ہے کہ:

كان أصحاب الحديث رقودا حتى جاء الشافعي فأيقظهم فتيقظوا.②	حدیث والے سوئے ہوئے تھے یہاں تک کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ آئے اور انھوں نے محدثین کو جگایا تب وہ جاگ پڑے۔

اور اب ان کو اپنی محنتوں کا ثمرہ ملنے لگا، غالبا امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے شروع میں اس لیے بدگمان ہوئے ہوں گے کہ بزرگوں کے اقوال پر وہ اعتماد نہیں کرتے لیکن ان کی تحریروں کو پڑھ کر جب ان کو محسوس ہوا کہ یہ تو حدیث کی قیمت پیدا کررہے ہیں تو بدگمانی جاتی رہی اور ان

---

① امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ہم عصر علماء کے مقابلے میں جو نئی راہ نکالی تھی اس کا اندازہ خطیب کی اس روایت سے بھی ہو سکتا ہے جسے ابوالفضل زجاج کے حوالے سے اپنی تاریخ بغداد میں خطیب نے روایت یہ ہے۔

لما قام الشافعي الى بغداد كان في الجامع اما نيف و اربعون حلقة او خمسون حلقة فلما دخل بغداد ما زال يقعد في حلقه حلقه و يقول لهم قال الله و قال الرسول و هم يقولون قال اصحابنا حتىٰ ما بقي في المسجد حلقة غيره(تاريخ بغداد للخطيب بغدادي، محمد بن ادريس بن العباس، ابو عبد الله الشافعي، رقم الترجمة ٤٥٤، ج:٢، ص: ٦٦	جن دنوں امام شافعی بغداد پہنچے تو اس زمانے میں جامع بغداد میں تقریبا چالیس یا پچاس حلقے درس کے قائم تھے لیکن جب شافعی بغداد آئے اور ہر ہر حلقہ میں بیٹھ کر کہنا شروع کیا اللہ یہ کہتا ہے اللہ کے رسول یہ کہتے ہیں، اور دوسرے علماء کہا کرتے تھے میرے اصحاب یعنی اساتذہ نے یوں کہا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقے کے سوا کوئی حلقہ باقی نہ رہا۔

② وفیات الاعیان، الامام الشافعی، رقم الترجمۃ: ۵۵۸، ج:۲، ص:۳۱۲،

کے بڑے زبردست حامیوں میں ہوگئے، ابن خلکان نے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

ما عرفت ناسخ الحدیث من منسوخه حتیٰ جالست الشافعی ①

یعنی حدیث کے منسوخ حصہ کو ناسخ حصہ سے الگ کرنیکا ڈھنگ اس وقت تک مجھے معلوم نہ ہوا جب تک امام شافعی کے پاس میرا اٹھنا بیٹھنا نہ ہوا تھا۔

بہرحال گذشتہ بالا اصول کو لے کر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ مصر پہنچے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں مصر پر مالکیوں کا اقتدار قائم تھا۔ درمیان میں ایک حنفی فقیہ اسماعیل آئے بھی تو پبلک نے ان کو ناپسند کیا اور باوجود دیانت پر بھروسہ کرنے کے ان کے قیاسی طریقہ کو مصریوں نے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ فقہ حنفی کے متعلق یہ وہ غلط العام بدگمانی ہے جس میں تقریباً ہر وہ شخص شروع میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کی امام کی اصول اور ان کی نظر کی گہرائیوں تک رسائی نہیں ہوتی، جس کا اثر اب تک باقی ہے، مصری بھی اس بدگمانی کے شکار تھے اور مدت تک سوءظن کے اس مرض میں گرفتار رہے۔

یہی وجہ ہوئی کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جب مصر پہنچے تو ان کا مقابلہ براہ راست جن لوگوں ہوا وہ ان کے استاد امام مالک ہی کے تلامذہ اور متبعین تھے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے فقہ کا بڑا حصہ مدینہ منورہ کے فقہاء سبعہ اور اہل مدینہ کے عمل پر مبنی تھا، یا یوں کہیے کہ مدینہ کے عملی رسم ورواج کو اپنے فتووں میں امام مالک بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے، مالکی علماء اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے نہ چنداں قرآنی آیت پیش کرنے کی ضرورت سمجھتے تھے اور نہ صحیح حدیث کی، فقہاء مدینہ کے اقوال ثبوت کے لیے کافی خیال کئے جاتے تھے۔ ان لوگوں کے سامنے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ یہ اعلان کرتے

① وفیات الاعیان لابن خلکان، الامام الشافعی، رقم الترجمۃ: ۵۵۸، ج:۲، ص:۳۱۲،

تھے کہ صرف تبع تابعین یا تابعین ہی نہیں بلکہ صحابی بھی معصوم نہ تھے۔اس لیے ''معصوم'' قانون کے لیے ''معصوم'' اساس کی ضرورت ہے وہ کتاب وسنت کے سوااور دوسری چیز کیسے ہوسکتی ہے؟ کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی صحابہ تک کے متعلق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہہ اٹھتے تھے:

نحن رجال وهم رجال. یعنی وہ بھی آدمی تھے اور ہم بھی آدمی ہیں۔

جن لوگوں کے نزدیک ان ہی رجال کے اقوال کا محل استدلال میں پیش کردینا کافی خیال کیا جاتا ہو، ظاہر ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس طرز عمل کا ان پر کیا اثر مرتب ہوتا ہوگا۔انتہاء یہ ہے کہ اشہب جو مصر میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے امام خیال کئے جاتے تھے باوجودیکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے استاد بھائی تھے اور فقیہ ہونے کی حیثیت سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تک ان کے متعلق یہ تصدیق کرتے تھے کہ:

ما أخرجت مصر أفقه من أشهب لولا طيش فيه.① مصر کی سرزمین اشہب سے زیادہ فقیہ آدمی نہ پیدا کرسکی، کاش! اس میں طیش کا جزء نہ ہوتا۔ (غالباً مغلوب الغیظ تھے)

مگر اشہب کے اس طیش کا حال امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مقابلہ میں بالآخر یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ علمی نوک جھونگ سے گذر کر وہ امام کے حق میں بددعائیں کرتے تھے خود ان کے رفیق درس عبداللہ بن الحکم کا بیان ہے کہ:

سمعت أشهب يدعوا على الشافعي بالموت.② میں نے اشہب سے سنا کہ وہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی موت کی دعا کرتے تھے۔

① حسن المحاضرۃ للسیوطی، من کان بمصر من الائمۃ المجتھدین، رقم الترجمۃ: ۴۰، ج:۱، ص ۲۶۵۔

② وفیات الاعیان لابن خلکان، اشہب تلمیذ مالک، رقم الترجمۃ: ۱۰۰، ج:۱، ص: ۱۲۸۔

امام شافعی کو بھی ان کی بددعا کی خبر پہنچی تو یہ شعر پڑھنے لگے۔

تمنی رجال أن أموت وإن أمت فتلك سبيل لست فيها بأوحد

''یعنی بعض لوگوں کی آرزو ہے کہ میں مرجاؤں اور میں اگر مرگیا تو یہ کوئی ایسی راہ نہیں ہے جس پر میں تنہا ہوں۔''

لیکن جس مصر کو حنفی فقہ سے اس لیے متنفر کیا گیا تھا کہ اس میں سنت رسول ﷺ کے ساتھ داؤ پیچ کیا جاتا ہے اب اسی سنت رسول ﷺ کا نام لے کر سمجھایا جاتا تھا کہ معصوم کے مقابلہ میں غیر معصوم ہستیوں کا قول وفعل کیسے حجت ہوسکتا ہے۔ مالکی فقہاء نے مقابلہ کرنا چاہا لیکن امام اشہب کے مذکورہ بالا طرز عمل ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ کوسنے پر اتر آئے تو مقابلہ کے میدان میں کیا ٹھہر سکتے تھے۔ آخر یہی ہوا کہ مصریوں پر روز بروز حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا اقتدار بڑھنے لگا اور آخر میں انتہاء یہ ہوگئی کہ اشہب اور ابن وہب جیسے مالکی ائمہ واساطین کے سب سے بڑے چہیتے شاگرد محمد بن عبداللہ بن الحکم نے مالکی طریقۂ اجتہاد کو ترک کر کے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کو اختیار کرلیا اور ان کے حلقۂ تلامذہ میں شریک ہوگئے۔① محمد بن الحکم جن کے متعلق سیوطی نے لکھا ہے کہ "کان افقہ زمانہ" ان کا مالکی مذہب ترک کر کے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ درس میں شریک ہوجانا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ سارا مصر بلکہ افریقہ میں ایک شور برپا ہوگیا پھر کیا تھا جوق در جوق ہر طرف سے طلبہ کھنچ کر امام شافعی کے درس میں حاضر ہونے لگے اسی سلسلہ میں بعض ایسے شاگرد بھی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو ملے جنہوں نے اپنی ساری زندگی ان کے پروگرام کے لیے وقف کردی، جن میں البویطی، ابویعقوب یوسف بن یحییٰ اور ربیع بن سلیمان المؤذن اور حرملہ وغیرہ بزرگوں کے علاوہ المزنی ابوابراہیم اسماعیل بن یحییٰ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں

① حسن المحاضرۃ للسیوطی، من کان بمصر من الائمۃ المجتھدین، رقم الترجمۃ: ۵۵، ج:۱،ص:۲۶۹۔

البویطی تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی وصیت کے مطابق ان کے حلقہ درس کے امام کی وفات کے بعد خلیفہ مقرر ہوئے اور ربیع نے ان کے تصنیفی ذخیروں کی تدوین وترتیب میں بڑا کام کیا، بلکہ سچ یہ ہے کہ بغداد میں جو کام امام سے جیسا کہ وہ چاہتے تھے نہ بن پڑا تھا، ان ہی شاگردوں کی بدولت اس کام کی تکمیل کا سامان غیب سے مہیا ہوگیا۔ اپنے تمام قدیم مجتہدات پر انہوں نے نظر ثانی کی، اور ''کتاب الام'' اپنی مشہور مطبوعہ کتاب کے سوا ''الامالی الکبری''، ''الاملاء الصغیر'' مصر ہی میں مرتب فرمائی، یہیں انھوں نے اپنا مشہور ''الرسالہ'' لکھا جو آج ہزار سال سے زیادہ مدت کے بعد اصول فقہ میں اپنی آپ نظیر ہے بلکہ کہا جاتا ہے کہ اس فن کی پہلی کتاب یہی رسالہ ہے۔

ان شاگردوں سے امام کو جو خاص تعلق تھا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مذکورہ بالا بزرگوں میں سے ہر ایک کے نام سے غالباً ان کے پڑھنے کے لیے آپ نے خاص کتابیں تصنیف فرمائیں جو مختصر البویطی، مختصر الربیع، مختصر المزنی کے نام سے مشہور ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو مصر میں اتنی مقبولیت کیوں حاصل ہوئی، اس کی ایک بڑی وجہ تو وہی تھی جو اوپر بیان کی گئی لیکن جہاں تک میرا خیال ہے اس سلسلہ میں ایک خاص جذبہ کو بھی تھوڑا بہت ضرور دخل تھا اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس زمانہ میں اسلامی علوم وفنون کی تدوین کا آغاز ہوا، عرب کے خاندانی افراد مثلاً قریش اور قریش کے مختلف خانوادوں کے لوگ عموماً سیاسی مشاغل اور حکومتی قصوں میں الجھے رہے، عام پبلک اور حکومت دونوں اسلام کی ایسی تفصیلی شکل کا مطالبہ کر رہے تھے جو زندگی کے تمام شعبوں اور ہر شعبہ کی تمام شاخوں پر عملاً منطبق ہوسکے، یہ ایک موقعہ تھا جس سے ملک کے ان خاندانوں نے نفع اٹھالیا جن کا حکومت سے تعلق نہ تھا اور اسی لیے فقہ ہو یا حدیث یا تجوید وقرأت ان تمام علوم کے ائمہ وماہرین کا تعلق زیادہ تر موالی یا ایسے خاندانوں سے ہے جنہیں ملک میں سیاسی حیثیت سے کوئی اہمیت نہ تھی۔

لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے فقہ کو حدیث وقرآن کے ساتھ وابستہ کرنے کا کام اپنے ہاتھ میں لیا، یہ عہد صحابہ وتابعین کے بعد پہلے قریشی امام ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی مقبولیت میں ایک حد تک ان کی اس نسبی خصوصیت کو بھی دخل ہے۔

صورت حال اس زمانہ میں کچھ ایسی آ پڑی تھی کہ گو سیاستِ عالم کی باگ عربوں کے ہاتھ میں اسلام کی بدولت آ گئی تھی لیکن اسلام نے ''لا فضل لعربي على عجمي '' کا جو نعرہ بلند کیا تھا اس بناء پر ہر طبقہ اور ہر فرقہ کو وہ عرب سے تعلق رکھتا ہو یا عجم سے اپنی اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقعہ اتنی آزادی سے مل گیا کہ چشمِ عالم نے شائد اس کا نظارہ نہ اس سے پہلے کیا تھا نہ اس کے بعد۔ کتابوں میں ایک مشہور واقعہ ہشام بن عبدالملک اموی خلیفہ کا نقل کیا جاتا ہے کہ ایک دن اس نے عطاء سے دریافت کیا۔

''اسلام کے امصار یعنی مرکزی شہروں کے علماء کے متعلق تم کچھ جانتے ہو، عطاء نے کہا کہ کیوں نہیں یا امیر المومنین۔ تب ہشام نے پوچھا کہ مدینہ کا فقیہ کون ہے؟ میں نے عرض کیا کہ نافع ابن عمر کے مولی (یعنی آزاد کردہ غلام)۔ ہشام نے کہا کہ مکہ کا فقیہ کون ہے؟ میں نے عرض کیا کہ عطاء بن ابی رباح۔ ہشام نے پوچھا کہ وہ مولیٰ ہیں یا عربی ہیں؟ میں نے کہا نہیں وہ بھی مولیٰ ہی ہیں۔ ہشام نے کہا کہ یمن کا فقیہ کون ہے؟ میں نے عرض کیا کہ طاؤس۔ پوچھا کہ مولی ہیں یا عربی؟ میں نے کہا کہ مولیٰ۔ اس نے پوچھا تو یمامہ والوں کا فقیہ کون ہے؟ میں نے کہا کہ یحییٰ بن کثیر۔ ہشام نے کہا کہ مولیٰ ہیں یا عربی؟ میں نے کہا کہ مولیٰ۔ اس نے پوچھا کہ شام والوں کا فقیہ کون ہے؟ میں نے کہا کہ مکحول۔ ہشام نے کہا کہ مولیٰ ہیں یا عربی؟ میں نے کہا کہ مولیٰ۔ تو جزیرہ والوں کا فقیہ کون ہے؟ ہشام نے کہا۔ میں نے عرض کیا، میمون بن مہران۔ پوچھا کہ وہ مولیٰ ہیں یا عربی؟ میں نے کہا نہیں وہ بھی مولیٰ ہیں۔ اس نے کہا کہ بصرہ والوں کا فقیہ کون ہے؟ میں نے کہا کہ حسن بصری اور ابن سیرین۔ ہشام نے پوچھا کہ یہ دونوں بھی مولیٰ

ہیں یا عربی؟ میں نے کہا کہ مولیٰ۔ اس نے کہا تو کوفہ والوں کا فقیہ کون ہے؟ میں نے کہا کہ ابراہیم نخعی۔ ہشام نے پوچھا کہ وہ بھی مولیٰ ہیں یا عربی؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں وہ تو عربی ہیں۔

عطاء کہتے ہیں کہ آخری سوال کے جواب میں بجائے مولیٰ کے جب ابراہیم نخعی کے متعلق میں نے کہا کہ وہ مولیٰ نہیں ہیں تو ہشام بولا:

كادت تخرج نفسي ولا تقول واحد عربي.① — قریب تھا کہ میری جان نکل جائے کہ تم ایک کو بھی عربی نہ کہتے۔

ظاہر ہے کہ مجبوری اور بات تھی ورنہ طبعاً عربوں کی خواہش یہی ہوسکتی تھی کہ علم اور دین میں بھی وہ دوسروں کے دست نگر نہ ہوتے تو اچھا تھا۔ بلکہ خلفاء بنی اُمیہ جن میں جاہلی عصبیت کا اثر کچھ نہ کچھ باقی رہ گیا تھا، اندرونی طور پر چاہتے تھے کہ موالی کے اس اقتدار کو کم کیا جائے مگر اسلام نے آزادی کا جو پرچم بلند کیا تھا ''أكرمكم عند الله أتقاكم'' کے قرآنی اعلان کا وہ بیچارے کیا

① اسلام کی پہلی صدی کے تقریباً تمام مرکزی شہروں کی دینی قیادت موالی (یعنی غیر عربی النسل افراد) کے ہاتھ میں پہنچ گئی تھی اور اس کا سلسلہ بعد کو بھی باقی رہا، اس رواداری کا ثبوت ہے جسے علماء اسلام نے پیش کیا۔ ایک مذہب آخر دنیا میں وہ بھی تھا جس نے غیر آریائی کانوں کے لیے وید سننے کی یہ سزا مقرر کی تھی کہ اس میں پگھلا کر سیسہ پلا دیا جائے۔ اور ایک مذہب وہ بھی ہے جس نے سارے عرب کو ہاتھ باندھ کر عجم کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ موالی کہاں کہاں کے تھے بڑا دلچسپ سوال ہے۔ شکر ہے کہ اس میں ہمارے ملک ہندوستان کا بھی کافی حصہ ہے، مکحول جو شام کے فقیہ تھے لکھا ہے کہ یہ نسلاً سندھ سے تعلق رکھتے تھے ان کے دادا کا نام ساول تھا۔ ابن خلکان نے یہ دلچسپ لطیفہ بھی لکھا ہے کہ کان سندیا لا یفصح (یعنی چونکہ سندھی تھے اس لیے عربی الفاظ کا صحیح تلفظ نہیں کر سکتے تھے۔) لکھا ہے کہ ساحر کے لفظ کر ساہر، حاجۃ کو ہاجۃ کی شکل میں ادا کرتے تھے لیکن باوجود اس کے زہری امام المحدثین کہتے تھے، لم یکن فی زمنہ ابصر منہ بالفتیا یعنی فتوی دینے میں جیسی بصیرت ان کو حاصل تھی اپنے زمانے میں ان سے بڑا اس باب میں کوئی نہ تھا۔ (وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۷۳۹، مکحول الشامی، ج:۳، ص:۱۴۲۔)

① المناقب للموفق، الباب الاول فی ذکر مولدہ ونسبہ رضی اللہ عنہ، ص:۱۲۔

مقابلہ کر سکتے تھے۔ میری غرض یہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا صرف عربی نہیں بلکہ عربوں میں بھی جو سب سے زیادہ مقتدر طبقہ قریش کا تھا چونکہ نسلاً اسی سے ان کا تعلق تھا اس لیے ایک وجہ عام رجحان کی خصوصاً حجازی عربوں کی ان کی طرف جو ہوئی یہ بھی تھی۔

بہر حال جیسا کہ بیان کر چکا ہوں، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو مصر میں بیس سال تک علم کی خدمت کرنے کا موقع ملا اور اشہب جوان کی موت کی تمنا میں رہتے تھے ان سے ایک مہینہ پہلے آپ نے وفات پائی۔ ① اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام کے بعد ان کے کارناموں کی حفاظت واشاعت کے لیے سعید ولائق شاگردوں کی ایک جماعت موجود تھی لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا صورت پیش آئی کہ ان کی زندگی میں لوگوں پر جو ان کا رعب تھا بظاہر وفات کے بعد اس کی وہ پہلی کیفیت باقی نہ رہی، یہی نہیں کہ ان کے بعد ان کے بعض شاگردوں مثلاً حرملہ نے امام کی رائیوں سے اختلاف کرنا شروع کیا جیسا کہ نووی نے لکھا ہے:

له مذهب لنفسه. ② — یعنی حرملہ اپنا خود ایک مستقل مذہب رکھتے تھے۔

بلکہ وہی مالکی امام یعنی محمد بن عبداللہ بن الحکم جنہوں نے امام کے اثر سے مالکی طریقہ کو ترک کر کے ان کی شاگردی اختیار کر لی تھی، کہا جاتا ہے کہ:

لما مات الشافعي رجع إلى مذهب مالك. ③ — جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوگیا تو محمد بن عبداللہ بن الحکم پھر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی طرف پلٹ گئے۔

---

① اشہب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۲۰۴ ہجری میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے ایک ماہ بعد ہوئی۔ (زاہد) وفیات الاعیان لابن خلکان، اشہب تلمیذ مالک، رقم الترجمۃ: ۱۰۰، ج: ۱، ص: ۱۲۸۔

② حسن المحاضرۃ للسیوطی، ذکر من کان بمصر من الائمۃ المجتہدین، رقم الترجمۃ: ۴۸، ج: ۱، ص: ۲۶۷۔

③ حسن المحاضرۃ للسیوطی، ذکر من کان بمصر من الائمۃ المجتہدین، رقم الترجمۃ: ۵۵، ج: ۱، ص: ۲۶۸۔

اور ٹھیک جس طرح مالکی مذہب کے ترک کرنے کا شافعی مسلک کی مقبولیت پر اثر پڑا تھا، محمد بن عبداللہ بن الحکم کے برگشتہ ہو جانے سے بھی شافعیت کی تحریک مصر میں متاثر ہوئی۔

محمد بن عبداللہ بن الحکم نے امام شافعی کے مسلک میں کیا نقص محسوس کیا؟ افسوس ہے اب تک تاریخوں میں مجھے اس کا کوئی معتبر جواب نہیں ملا۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان سے جس وقت کتاب اور سنت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام لے کر اپیل کی جاتی ہے تو انسان جو حتی الوسع یقین کا طالب ہے اس پر یہ آواز اثر انداز ہوتی ہے لیکن دوسری بات کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مدینہ کے چند فقہاء کے اقوال کو اور امام ابوحنیفہ قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں، تجربہ سے عموماً یہ دعویٰ ہمیشہ بے بنیاد ثابت ہوا ہے، بلکہ تحقیق سے بالآخر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کے فقہاء ہوں یا امام ابوحنیفہ اور ان کے کوفی اساتذہ حماد، ابراہیم نخعی، علقمہ، اسود، ان سبھوں کے فتوؤں کی بنیاد بالآخر کسی صحیح حدیث یا کم از کم ان اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل پر مبنی ہے جن کے ساتھ قرآن میں اپنی رضامندی کا اظہار فرمایا گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کی اتباع کا امت کو حکم دیا ہے، غالباً یہی واقعہ محمد بن عبداللہ کو بھی پیش آیا، لیکن اسی کے ساتھ شافعیت کی تحریک کا ایک نفع امت کو ہمیشہ پہنچتا رہا ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ قیامت تک پہنچتا رہے گا۔ کہ جب کبھی مسلمانوں کے علماء فقہ اور فقہی جزئیات میں غلو کرتے ہوئے قرآن و حدیث سے کچھ دور ہوئے ہیں تو ہمیشہ ہر ملک میں اس تحریک نے اٹھ کر مسلمانوں کو چونکایا اور اصلی سرچشمہ سے کہیں یہ ٹوٹ نہ جائیں، اس مصیبت سے بچایا ہے۔ گویا قدرت نے اسلام میں اس جماعت کو حزب الاختلاف کی حیثیت سے پیدا کیا ہے جو تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد مسلمانوں کو مجبور کرتی رہی ہے کہ وہ اپنی مذہبی زندگی کا جائزہ لیں اور ان کو اساسی مستندات پر پیش کر کے جانچ لیا کریں اور اسی چیز نے بحمداللہ مسلمانوں کو کتاب و سنت سے (اگر کبھی یہ دور بھی ہو گئے ہیں) قریب رکھا ہے۔ امام احمد بن حنبل

رحمۃ اللہ علیہ سے جو یہ منقول ہے کہ:

ما بت منذ ثلاثين سنة إلا وأنا أدعوا للشافعي.①

تیس سال کی مدت میں میں نے کبھی نہیں رات گذاری مگر اس حال میں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔

تو اس کا غالبًا یہی مطلب ہے کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا امت پر یہ ہمیشہ کے لیے ایک بڑا احسان رہ گیا اور یہ واقعہ ہے کہ ہمیشہ اس تحریک کے بعد ان لوگوں کو بھی جو ائمہ ہداۃ میں سے کسی امام کے مسلک کے ساتھ اپنے کو مقید رکھتے ہیں، ان کی نگاہ میں بھی تقلید کے ساتھ تحقیق کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے، گویا ان کی تقلید نری تقلید نہیں بلکہ تحقیقی تقلید ہوتی ہے، محمد بن عبداللہ ہی کے متعلق کتابوں میں لکھتے ہیں کہ گو انھوں نے مالکی مسلک کو پھر قبول کر لیا تھا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت و تعلیم کا ان پر یہ اثر باقی رہ گیا تھا کہ:

ربما يتخير مذهب الشافعي عند ظهور الحجة.②

بسا اوقات وہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کو اس وقت قبول کر لیتے تھے جب دلیل واضح ہو جاتی تھی۔

مگر کچھ بھی ہو، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان کے مسلک کا وہ زور و شور مصر میں باقی نہ رہا۔ خصوصاً محمد بن عبداللہ کے طرز عمل سے شافعیت کے بازار کی گرمی نسبتاً کچھ سرد سی پڑ گئی اور مختلف جہات سے امام پر نکتہ چینیاں شروع ہو گئیں۔ خصوصاً امام اشہب کے تلامذہ اور ماننے والوں کو تو اچھا موقعہ ہاتھ آیا جیسا کہ میں نے عرض کیا امام کا حلقۂ درس کا تعلق تو بویطی سے تھا اور کتابوں کی تدوین اور اشاعت کی ذمہ داری ربیع المؤذن نے لے لی تھی۔ لیکن مخالفت کے اس طوفان کے

① وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۵۵۸، الامام الشافعی، ج: ۲، ص: ۳۱۲۔

② حسن المحاضرۃ للسیوطی، ذکر من کان بمصر من الائمۃ المجتہدین، رقم الترجمۃ: ۵۵، ج: ۱، ص: ۲۶۹۔

مقابلہ کے لیے امام کے شاگردوں میں جو شخص آستین چڑھا کر کھڑا ہو گیا وہ ان کے شاگرد المزنی ابوابراہیم اسماعیل تھے اسی وجہ سے شافعی مورخین نے ان کا لقب ہی ناصر المذہب قرار دے رکھا ہے، واللہ اعلم، یہ روایت کہاں تک درست ہے کہ:

قال الشافعي في حق المزني ناصر مذهبي.①

خود امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ المزنی میرے مذہب کا ناصر اور یار و مددگار ہوگا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بطور پیش گوئی کے، یا انکی فطرت کا اندازہ فرمانے کے بعد کہا تھا کہ:

المزني لو ناظر الشيطان لغلبه.②

اگر شیطان سے بھی مزنی کو مناظرہ کا موقعہ مل جائے تو شیطان کو بھی وہ دبا دیں گے۔

تاریخ میں ان کے لیے خاص خاص الفاظ غالبًا اسی خدمت کے معاوضہ میں استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً:

كان جبل علم مناظرا محجاجا.③

وہ علم کے پہاڑ تھے مناظرہ کرنے والے اور بڑی زبردست حجت پیش کرنے والے۔

---

① وفات الاعیان لابن خلکان، المزنی صاحب الشافعی، رقم الترجمۃ: ۹۳، ج: ۱، ص: ۱۱۷۔

②، ③ حسن المحاضرۃ للسیوطی، ذکر من کان بمصر من الائمۃ المجتھدین، رقم الترجمۃ: ۴۹، ج: ۱، ص: ۲۶۷۔

②

مصر میں حنفیت کی حالت:

بہر حال یہ قصے تو موالک اور شوافع کے درمیان مصر میں جاری تھے رہی حنفیت تو اس کا ابتدائی حال تو وہی تھا کہ مصری قاضی اسمٰعیل بن السمیع (السیع)① کو صرف اس لیے برداشت نہ کر سکے کہ وہ حنفی تھے اور یہ حال تو مصر کا اس وقت تھا جب اس ملک پر زیادہ تر مالکیت ہی کا رنگ غالب تھا پھر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تشریف آوری کے بعد شافعیت کے اثرات بھی اس ملک پر قائم ہوئے تو بظاہر یہی قیاس ہونا چاہیے کہ حنفیت سے مصر کو بجائے قرب کے بعد ہو گیا ہوگا، لیکن جہاں تک واقعات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، چند قدرتی امور ایسے پیش آتے رہے کہ معاملہ کی نوعیت یہ نہ ہو سکی۔

ایک بڑا واقعہ تو قاضی اسحاق بن الفرات التجیبی کے تقرر ہی کا ہے، قضا کے عہدہ پر ان کے تقرر کا قصہ بھی عجیب ہے، واقعہ یہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جس زمانہ میں مصر آئے ہیں ان سے کچھ دن پہلے حکومت عباسی کے محکمہ عدلیہ کا اختیار قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ میں آ چکا تھا، اس بناء پر جہاں اور تمام علاقوں میں زیادہ تر حنفی مکتب خیال کے قضاۃ کا تقرر ہوا، مصر میں بھی حکومت نے ایک کوفی عراقی قاضی کو بھیجا جن کا نام محمد بن مسروق تھا، یہ بڑے جاہ وجلال کے قاضی تھے، ان سے پہلے مصر میں قضاۃ سرکاری کاغذات کو بستے میں باندھ کر اپنے ساتھ لایا کرتے تھے مگر اس شخص② نے باضابطہ دفتر قائم کر کے تمام متعلقہ کاغذات کو مہر لگانے کے بعد دفتر میں محفوظ کرانے

---

① حسن المحاضرۃ رحمۃ اللہ علیہ میں کا نام اسماعیل بن السیع جب کہ باقی کتب جیسا کہ الجرح والتعدیل میں اسماعیل بن السمیع درج ہے۔ (زاہد)

② الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ، حرف المیم، رقم الترجمۃ: ۴۰۷، محمد بن مسروق، ج: ۲، ص: ۱۳۳۔

کا طریقہ جاری کیا مگر ظاہری جاہ وجلال کے سوا باطن کچھ بہتر نہ تھا۔ السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

لم يكن المحمود في ولائته وكان فيه عتو وتجبر.①

اپنے عہدہ کے فرائض کی ادائیگی میں قابل ستائش نہ تھے ان کے مزاج میں بڑائی اور زبردستی کا مادہ تھا۔

اور غالباً ان ہی وجوہ سے مصریوں نے اس حنفی قاضی کو بھی واپس کیا۔ اسی زمانہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ قیام کرنے کے لیے مصر پہنچے، محمد بن مسروق کی جگہ قاضی کی تلاش تھی، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسحاق بن الفرات کا محمد بن مسروق الکندی کی جگہ قضاء کے عہدہ پر جو نیابتاً تقرر ہوا اس میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہاتھ تھا۔ امام کا قول یہ نقل کیا ہے کہ:

أشرت إلى بعض الولاة أن يولي إسحاق بن الفرات القضاء.

میں نے بعض والیوں کو اشارہ کیا کہ اسحاق بن فرات کو یہ عہدہ سپرد کیا جائے یعنی قضاء کا۔

اسحاق بن الفرات اگرچہ مسلکاً حنفی تھے تاہم حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی بحالی کی جو سفارش کی اس کی وجہ بھی خود ہی یہ بیان فرمائی ہے کہ:

فإنه يتخير وعالم باختلاف من مضى.②

(باوجود مقلد ہونے کے) پھر بھی اپنی خاص رائے اختیار کرتے ہیں اور گذشتہ زمانہ کے اختلافات سے بھی واقف ہیں۔

جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ گو عمومی طور پر ان کا رجحان اسلامی قانون کی تشریح میں حنفی مکتب خیال کی طرف تھا لیکن اس کے ساتھ اپنی ذاتی رائے بھی رکھتے تھے ''فإنه يتخير'' کا یہی مطلب ہے۔ ''وعالم باختلاف من مضى'' سے اشارہ اس طرف تھا کہ حوادث وواقعات پر حکم

① حسن المحاضرۃ للسیوطی، ذکر قضاۃ مصر، ج:۲، ص:۱۳۷۔

② تہذیب التہذیب لابن حجر، رقم الترجمۃ ۴۰۷، ج:۱، ص:۲۶۲۔

لگانے میں یہ فوراً قیاس کی طرف رجوع نہیں کرتے بلکہ گذشتہ بزرگوں کے اختلافات کے چونکہ عالم ہیں اس لیے ان کو بھی اجتہاد کے وقت پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس واقعہ سے اگر ایک طرف حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی بے تعصبی کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف ان کا جو نصب العین تھا اس پر بھی روشنی ہوتی ہے۔ اسحاق کے بعد حنفیوں میں سے اور بھی چند قضاۃ مصر میں آتے رہے، جن میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن کے خاندان کے ایک بزرگ ہاشم بن ابی بکر بن عبداللہ بن ابی بکر عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سیوطی نے اور صاحب ''جواہر مضیہ''، نیز الکندی سبھی نے ان کے متعلق تصریح کی ہے کہ:

كان يذهب بمذهب أبي حنيفة.① وہ ابوحنیفہ کے مسلک پر چلتے تھے۔

ان سے پہلے مصر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خاندان کے ایک بزرگ قاضی تھے جن کا نام عبدالرحمٰن العمری تھا اور ہاشم ''البکری'' کی نسبت سے منسوب تھے۔ عبدالرحمٰن اپنی ولایت میں محمود ثابت نہ ہوئے ''البکری'' اور ''العمری'' دونوں قاضیوں کے درمیان حساب و کتاب کے معاملات میں بعض ناگوار واقعات پیش آئے یہاں تک کہ العمری کو جیل جانا پڑا، رات کو دیوار پھاند کر بھاگے، شاعر نے شعر کہا:

هرب الخائن ليلا فجمح وأتى امرأ قبيحا فتضح

مگر ہاشم ان خوش قسمت قاضیوں میں ثابت ہوئے جن کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ:

توفي بمصر وهو على قضائها.② ان کی وفات مصر ہی میں ہوئی جبکہ وہ قضا کے عہدہ پر سرفراز تھے۔

ورنہ اس زمانہ میں ایسا واقعہ بہت کم پیش آتا تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہاشم کی وجہ سے

① الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ، حرف الھاء، ج:۲، ص:۲۰۴۔ وحسن المحاضرۃ للسیوطی، ذکر قضاۃ مصر، ج:۲، ص:۱۳۸۔

② کتاب الولاۃ وکتاب القضاۃ للکندی، باب: ھاشم بن ابی بکر البکری، ج:۱، ص:۲۹۶۔

مصریوں پر حنفیت کے متعلق اچھا اثر پڑا تھا لیکن ان کے بعد ابراہیم بن الجراح جو قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز تلامذہ① میں تھے اور جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ:

هو اخر من روى عن أبي يوسف. — قاضی ابو یوسف سے روایت کرنے والوں میں سب سے آخری آدمی وہی ہیں۔

افسوس ہے کہ باوجود فضل وکمال کے وہ اپنے لڑکے کی اندھی محبت میں صراط مستقیم پر قائم نہ رہ سکے۔ السیوطی اور الکندی دونوں نے لکھا ہے:

فلما قدم ابنه من العراق تغير حاله وفسدت أحكامه. — جب ابراہیم کے صاحبزادے عراق سے ان کے پاس مصر آئے تو ان کی حالت میں تغیر پیدا ہو گیا اور ان کے فیصلے ٹھیک نہ رہے۔

الغرض اچھے ہوں یا برے لیکن حنفی قاضیوں کی آمد ورفت کی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے مسلک سے مصریوں میں جو وحشت تھی وہ بتدریج کم ہوتی جارہی تھی لیکن پھر بھی جیسا کہ چاہیے تھا کتابی شکل میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب کے علوم سے مصری دراصل اس وقت تک صحیح طور پر واقف نہ ہوئے جب تک کہ ایک خاص واقعہ پیش نہ آیا۔ تفصیل اس کی یہ ہے:

ایک خاص واقعہ:

مغرب (قیروان) کے ایک صاحب جن کا نام اسد الدین بن الفرات تھا، طلب علم کے شوق میں مغرب سے مصر پہنچے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ خصوصاً ابن القاسم سے ان کی بڑی خصوصیت

① یہاں ایک بات ایسی ہے جس کے ذکر کئے بغیر جی نہیں مانتا، ابراہیم بن الجراح ہی کی طرف قاضی ابو یوسف کی موت کے وقت کا واقعہ منسوب کیا جاتا ہے۔ ابراہیم کہتے ہیں کہ قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ بیمار تھے میں عیادت کے لیے گیا۔ ان کی حالت غیر تھی لیکن اس وقت بھی مجھے دیکھ کر فرمایا کہ ابراہیم رمی جمار پیدل کرنا مستحب ہے یا سوار ہو کر۔ میں نے پیدل کہا، بولے نہیں، میں نے کہا تو سوار ہو کر۔ بولے یہ بھی غلط، پھر مسئلہ کی تفصیل کی، میں باہر نکلا، کہ اندر سے شور کی آواز آئی معلوم ہوا کہ قاضی ختم ہو گئے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی آخری سانس تک ان ہی لوگوں نے خدمت کی۔

پیدا ہوگئی کچھ دن ان کے پاس قیام کر کے اپنے ملک کے دستور کے خلاف بجائے وطن کی طرف واپس لوٹنے کے مصر سے عراق پہنچ گئے۔ عراق میں ان کی رسائی محمد بن الحسن الشیبانی تک ہوئی، ایک پڑھے پڑھائے عالم شاگرد کا ہاتھ آنا، امام محمد کی خاص توجہ کا باعث ہوا، مورخین کا بیان ہے کہ امام محمد نے اس بن الفرات کو صرف پڑھایا ہی نہیں تھا بلکہ:

"زقه محمد بن الحسن الشيباني الفقه زقا" (نظرة تاريخه تيمور پاشا مصری)

یعنی جیسے کبوتر اپنے بچوں کی چونچ میں چونچ ڈال کر دانہ کھلاتے ہیں، گویا اسی طرح امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے حنفی فقہ اور اس کے ملاحظ ونقاطِ نظر اسد بن الفرات کو گھول کر پلا دیئے۔ اسد عراق سے ایک نئے علم اور اس کے ذخیرے کو لے کر جب دوبارہ لوٹ کر مصر آئے تو عراق میں ''اسلامی قانون'' کی تدوین کا کام جس شان سے ہوا تھا اس کی رپورٹ مصری علماء کو انھوں نے ان الفاظ میں سنائی۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے دو واسطوں سے اپنی تاریخ میں ابن اسد بن الفرات سے یہ بیان نقل فرمایا ہے:

كان أصحاب أبي حنيفة الذين دونوا الكتاب أربعين رجلا وكان في العشرة المتقدمين أبو يوسف وزفر وداؤد الطائي وأسد بن عمرو ويوسف بن خالد السمتي ويحيى بن زكريا بن أبي زائده وهو الذي يكتبها لهم ثلاثين سنة.①

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں جن لوگوں نے کتاب (فقہ حنفی) پر مرتب کی یہ چالیس آدمی تھے، جن میں دس آدمی جن کو سب پر تقدم حاصل تھا حسب ذیل حضرت تھے: ابو یوسف، زفر، داؤد طائی، اسد بن عمر، یوسف بن خالد سمتی، یحییٰ بن زکریا ابی زائدہ اور یحییٰ ہی وہ شخص ہیں جنہوں نے تیس سال تک علماء کی اس مجلس شوریٰ کے②

① الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ، باب من اسمہ اسد واسرائیل، ج:۱، ص:۱۴۰۔

② اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس کام کی تکمیل میں کم وبیش تیس سال کا عرصہ لگا یعنی ۱۲۱ ہجری سے ۱۵۰ ہجری تک جس میں۔۔۔

فیصلوں کے لکھنے کا کام انجام دیا۔

تیس سال تک ''وضع قوانین'' کی اس مجلس ① کو ایسے زبردست اراکین اور ممبروں کی رہنمائی میں کام کرنا، جن میں ہر ایک اسلامیات اور عربی ادبیات کے کسی نہ کسی شعبہ کا امام ہو، اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے صدر کی نگرانی میں یہ کام ہوتا رہا ہو، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مصری علماء جواب تک اس طریقہ سے ناواقف تھے ان پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ ان بیچاروں کو مالکی فقہ یا شافعی مجتہدات کے متعلق جو کچھ تجربہ ہوا تھا وہ انفرادی کام کا ہوا تھا، یعنی ایک عالم اپنے معلومات کو سامنے رکھ کر ذاتی طور پر حوادث وواقعات کے متعلق اپنی رائے قائم کرتا تھا لیکن یہ صورت کہ صدر مجلس شریعت اسلامی کے ہر باب کے متعلق روزانہ سوالات کی ایک فہرست اراکین مجلس کے سامنے پیش کرتا ہے، مجلس کے ہر رکن کو حکم ہے کہ اپنی اپنی خصوصی معلومات کی روشنی میں ہر سوال کے متعلق حکم پیدا کریں۔ ہر شخص اپنے خیالات صدر کے سامنے باری باری سے پیش کرتا ہے سب کی رائے سنی جاتی ہے، اس پر بحث وتنقید ہوتی ہے، آخر میں صدر لوگوں کو اپنی رائے سے مطلع کرتا ہے پھر مجلس کے اراکین کبھی اس سے اتفاق کرتے ہیں اور کبھی اختلاف، اس درمیان میں مجلس کی پوری کاروائی یا کم از کم مباحث کے نتائج ایک شخص باضابطہ ان کو اپنے رجسٹر میں درج کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کو حکم ہے کہ ہر رکن کی رائے خواہ مخالف ہو یا موافق سب کے نام کی

۔۔۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات واقع ہوئی لیکن یہ غلط ہے کہ یحییٰ تیس سال تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ یحییٰ کی ولادت ۱۲۰ ہجری میں عمل میں آئی اس لیے وہ تیس سال تک اس کام میں کیونکر شریک ہو سکتے ہیں۔

① میں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس مجلس علماء کی تعبیر قصداً مجلس وضع قوانین کے الفاظ سے کی ہے تاکہ وضع قوانین کے شورائی طریقہ کی ایجاد کا آج جو مغرب مدعی ہے یا سے اپنے رومانی ویونانی اسلاف کی خصوصیت قرار دیتا ہے اس کی غلطی ثابت ہو، ہاں دونوں مجلسوں میں اگر فرق تھا تو صرف اس قدر کہ مغربی مجالس قانون کے اساسی اصول ملک کے قدیم رسم و روایات یا رومانی ویونانی قوانین ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ مجلس بجائے اس کے کتاب وسنت واثارِ صحابہ کی روشنی میں قانون بناتی تھی۔

تفصیل کے ساتھ رجسٹر میں درج کی جائے اور یونہی یہ کام تیس سال تک جاری رہتا ہے، تا اینکہ ''اسلامی قوانین'' کا ایک طومار ① تیار ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لوگ لکھتے ہیں۔ اسلام کے مختلف ابواب کے متعلق تقریباً نو سو (۹۰۰) کتابیں مجلس شوریٰ کے اسی رجسٹر سے انھوں نے تیار کیں۔ آج وہی کتابیں، کتاب الطہارت، کتاب الصلوٰۃ، کتاب المعاقل، کتاب المساقاۃ وغیرہ کے نام سے فقہ کی کتابوں کی جز بنی ہوئی ہیں۔

جہاں تک میرا خیال ہے اسد بن الفرات کی یہ رپورٹ مصریوں کے لیے ایک انقلابی رپورٹ تھی بظاہر یہ بھی معلوم ہوتا ہے وضع قوانین کی اس مجلس کی مدونہ کتابوں کی نقلیں بھی اسد اپنے ساتھ عراق سے مصر لائے، اور ''الذین دونوا الکتب'' سے ان ہی منقولہ کتابوں کی تدوین کی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے تھے، بعض واقعات مثلاً طحاوی کے حوالہ سے عموماً کتابوں میں المزنی کے متعلق جو یہ فقرہ نقل کیا جاتا ہے کہ:

كان يديم النظر في كتب أبي حنيفة.② المزنی ابوحنیفہ کی کتابوں کا مطالعہ برابر کرتے رہتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اسکول کی کتابیں پھیل چکی تھیں جہاں تک میرا خیال ہے منجملہ اور ذرائع کے مصر میں حنفی مسلک کی کتابیں زیادہ تر اسد بن الفرات ہی کے توسط سے پہنچی ہیں۔

---

① فقہِ حنفی کی تدوین مذکورہ بالا شورائی طریقہ سے ہوئی یہ ایک مستقل مقالہ کا موضوع ہے لیکن جو کچھ عرض کیا گیا ہے آپ کو احناف کے طبقات اور ان کے مناقب میں اس کی تفصیل آسانی کے ساتھ مل سکتی ہے۔ بخوفِ طوالت بیان حوالوں کو ترک کر دیا گیا ہے۔

② وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ ۲۵، الطحاوی، ج:۱، ص:۴۴۔

فقہ مالکی کی تدوین وترتیب:

بہرحال میرا خیال ہے اور قرائن اور قیاسات اس کے مؤید ہیں کہ اسد بن الفرات جب عراق سے مصر واپس ہوئے تو حنفی مذہب کے متعلق مصر نے ایک نئی کروٹ لی، اور اسد ہی کی بدولت ''مالکی فقہ'' جواب تک غیر مرتب حال میں اور زیادہ تر ''درسینہ'' تھا اس کی ترتیب اور سفینہ میں لانے کا خیال بھی مالکی مذہب کے علماء کو پیدا ہوا۔ ابن خلکان کی اس سلسلہ میں تو صریح اور واضح شہادت ہے کہ مالکی مذہب کی اساسی کتاب ''المدونہ'' کی ترتیب کا خیال عراق سے اس بن الفرات کی واپسی کے بعد ہی پیدا ہوا، ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

أول من شرع في تصنيف المدونة أسد بن الفرات المالكي بعد رجوعه من العراق.①

''المدونہ'' کی تصنیف جس شخص نے ابتداء میں شروع کی وہ اسد بن الفرات مالکی ہیں عراق سے لوٹنے کے بعد اس کام کو انھوں نے شروع کیا۔

خود اسد بن الفرات کا مدونہ کی تدوین کی طرف متوجہ ہونا اس کی دلیل تھی کہ جو کچھ انھوں نے عراق میں دیکھا تھا، اسی طرز عمل کو ''مالکی فقہ'' کی تدوین کے متعلق اختیار کرنا چاہتے تھے بلکہ قاضی ابن خلکان کے الفاظ "بعد رجوعه من العراق" کے بعد تو اس میں شک کرنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

المدونہ کی تدوین کیونکر ہوئی:

مگر ''المدونہ'' کی تدوین کا کام کس طرح مکمل ہو کر موجودہ شکل تک پہنچا، اس کی داستان بھی عجیب ہے۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ اسد بن الفرات کے مالکی استاذ، ابن القاسم جن کا ذکر بار

① وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۳۸۲: سحنون، ج: ۲، ص

بار آ چکا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں تھے ان میں اور اسد بن الفرات میں مدونہ کی تدوین کے متعلق کچھ گفتگو ہوئی، اس مشورہ کا مفصل حال تو مجھے نہ مل سکا، لیکن ابن خلکان کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس وضع قوانین کے ایک ناقص چربہ اتارنے کی کوشش مدونہ کی تدوین میں کی گئی، قاضی ابن خلکان نے المدونہ کی ابتدائی تدوین کی حالت بیان کرتے وقت لکھا ہے:

أصلها أسئلة سأل عنها ابن القاسم فأجابه عنها. ①

مدونہ کی اصل دراصل وہ سوالات ہیں جو ابن القاسم سے پوچھے گئے اور انھوں نے ان سوالات کے جوابات دیئے۔

یعنی جیسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں پہلے سوالات قائم کر لیے جاتے تھے اور پھر جوابات ان کے نیچے درج ہوتے تھے، یہی طریقۂ کار مدونہ کی تدوین میں بھی اختیار کیا گیا، لیکن کہاں امام کی مجلس کے سوالات کے متعلق ہر ہر رکن کا اپنا خیال ظاہر کرنا اور پھر ہر ایک کا اپنے نقطۂ نظر کی توجیہ میں وجوہ پیش کرنا، ان پر بحث ہونا، بالآخر کسی نتیجہ تک وفاقاً یا اختلافاً مجلس کا پہنچنا اور ہر ایک کی رائے کا بجنسہٖ مجلس کے رجسٹر میں درج ہونا، اور کہاں ایک ابن القاسم کے جوابات دونوں میں جو فرق ہوسکتا تھا سو ظاہر ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ''مدونہ'' کے سوالات اسد ابن الفرات نے حنفی مکتب خیال ہی کی کتابوں کی روشنی میں پیدا کیے ہوں گے اور ابن القاسم نے ان سوالات کے متعلق جو کچھ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہوگا وہ یا امام مالک کے اصول اجتہاد کو پیش نظر رکھ کر جو کچھ ان کے اور ان کے رفقاء کار کی سمجھ میں آیا ہوگا وہ سب درج کرائے ہوں گے، جس کے معنی یہ ہی ہوئے کہ اگر اسد بن الفرات اسلامی قوانین کی ترتیب کا طریقہ عراق سے سیکھ کر نہ آتے تو حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تلامذہ کا علم منتشر اور پراگندہ حالت ہی میں رہ جاتا، آخر اگر

① وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۳۸۲: سحنون، ج: ۲، ص رحمۃ اللہ علیہ

یہ واقعہ نہ تھا تو ''مدونہ'' کی تدوین کا خیال عراق سے جب اسد واپس آئے اسی وقت کیوں پیدا ہوا، حنفی مؤرخین جو اپنی کتابوں میں یہ نقل کرتے ہیں کہ علامہ ابن سریج الشافعی جو شوافع کے طبقہ میں ''الباز الاشہب'' کے لقب سے مشہور ہیں اور تیسری صدے کے مجددوں میں بعضوں نے ان کو گنا ہے، چار سو کتابوں کے خود مصنف تھے، انھوں نے کسی کو دیکھا کہ وہ امام ابوحنیفہ پر کچھ طنز کر رہا ہے، ابن سریج نے (یاہذا) کہتے ہوئے اس کو مخاطب کیا اور فرمانے لگے:

اتقع في أبي حنيفة وثلاثة أرباع العلم مسلمة له وهو لا يسلم لهم الربع.

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں باتیں کرتے ہو حالانکہ تین چوتھائی حصہ علم امام ابوحنیفہ کے لیے مسلم ہے اور امام ابوحنیفہ کسی دوسرے کی ایک چوتھائی علم کے بھی رہین منت نہیں ہیں۔

ابن سریج کی اس عجیب بات کو سن کر طعن کرنے والے نے ان سے حیرت سے پوچھا کیف ذلک (آخر یہ کیسے ہے) ابن سریج نے فرمایا، اور عجیب بات کہی:

لأن العلم سوال وجواب، وهو أول من وضع الأسئلة فلها نصف العلم وأجاب عنها فقال مخالفه في البعض: أصاب وفي البعض: أخطاء، فإذا قابلنا صوابه بخطائه فله نصف النصف أيضا فسلم له الثلاثة أرباع العلم بقي الربع فهو يدعيه ومخالفوه يدعونه وهو لايسلمه لهم.①

علم دراصل سوال وجواب کے مجموعہ کا نام ہے، تو سوالات جتنے علم (فقہ) کے ہیں وہ امام ابوحنیفہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں اس لیے آدھا علم تو بالکلیہ ان ہی کا حصہ ہوا، پھر ان سوالات کے جوابات بھی انھوں نے دیئے، اب جو لوگ ان کے مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان جوابوں میں بعضوں میں تو وہ حق پر ہیں اور بعضوں میں ان سے چوک ہوئی پس جب ہم ان جوابوں کو جنہیں سب صحیح سمجھتے ہیں اور ان جوابوں کو جن کے متعلق

① (مقدمہ مسانید الأعظم، ج:۱،ص:۳۴)

سمجھا جاتا ہے کہ امام سے چوک ہوئی ہے دونوں کو جب ملاتے ہیں تو صحیح جوابوں کی مقدار کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ نصف کا نصف بھی امام ہی کا حصہ ہوا، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ تین چوتھائی حصہ فقہ کا تو مسلم ابوحنیفہ ہی کا ہوا، البتہ ایک چوتھائی باقی رہ جاتی ہے امام ان کی صحت کے مدعی ہیں اور ان کے مخالف ان کو نہیں مانتے مگر امام اس چوتھائی میں بھی ان لوگوں کی بات کو نہیں مانتے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی مجلس کے اراکین کا اس باب میں پیش رو ہونا ایک ایسی بات تھی جو تقریباً اس زمانہ میں مسلم تھی، احمد بن عبداللہ قاضی بصرہ نے بھی ''الشروط'' یا ''وقائق ومعاہدات'' کی تعبیر میں اس کا اقرار کیا تھا ''الناس عيال على أبي حنيفة في الفقه ''جس کے متعلق احناف میں مشہور ہے کہ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے، اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور ابن سریج کا بیان غالباً امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اسی قول کی شرح ہے۔

بہرحال جہاں تک فرائض وقیاسات کا اقتضاء ہے، اسد بن الفرات کے سوالات حنفی مکتب خیال کی کتابوں اور ان لوگوں کی تعلیم ہی کی روشنی میں قائم کیے گئے تھے، رہے جوابات، تو گو عموماً مشہور یہی ہے کہ ابن القاسم کے لکھوائے ہوئے ہیں لیکن ابن خلکان ہی نے اس کے بعد جو کچھ لکھا ہے اس سے تو کچھ اور ہی معلوم ہوتا ہے۔ ابن خلکان نے اس کے بعد لکھا ہے کہ اسد بن الفرات اس کتاب کو یعنی اپنے سوالات اور ابن القاسم کے جوابات کے مجموعہ کو لے کر قیروان پہنچے، وہاں ان کے شاگرد مالکی مذہب کے مشہور عالم سحنون ہوئے، تعلیم کے ساتھ اس کتاب کو بھی

لکھا۔

كتبها عنه سحنون.	سحنون نے اسد سے یہ کتاب بھی نقل کی۔

ابن خلکان کا بیان ہے کہ مغرب میں اس وقت تک اس مجموعہ کا نام بجائے ''المدونہ'' کے اسد بن الفرات کی نسبت سے ''الاسدیہ'' ہی تھا مگر بعد کو سحنون خود ابن القاسم کی خدمت میں مصر آئے اس کے بعد ابن خلکان نے جو بات لکھی ہے اسی کو مجھے پیش کرنا مقصود ہے وہ لکھتے ہیں کہ سحنون نے ابن القاسم کے پاس پہنچ کر:

فعرضها وأصلح فيها مسائل.①	سحنون نے (اسد بن الفرات) کے نسخہ کو ابن القاسم پر پیش کیا اور چند مسائل کو درست کیا۔

اسد جن کا علم دو آتشہ تھا (یعنی ابن القاسم اور امام محمد دونوں کے شاگرد تھے اور اس لیے فقہ مالکی وفقہ حنفی دونوں کے عالم تھے) ان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ اس کتاب میں ان سے علمی غلطیاں سرزد ہوئی تھیں، جن کی اصلاح سحنون نے ابن القاسم سے کرائی، ذرا مشکل ہے بظاہر قیاس میں یہ بات آتی ہے کہ اس سوال ہی کی حد تک نہیں بلکہ جوابوں میں بھی حنفی خیالات سے متاثر تھے اور اسی تاثیر نے ان کی کتاب کو قابل اصلاح بنا دیا تھا، اور یہ روایت تو قاضی عیاض وغیرہ کے حوالہ سے ابن خلکان نے نقل کی ہے۔ اس کے ساتھ مشہور نحوی متن کافیہ کے مصنف علامہ ابن حاجب المالکی کے بیان کے ایک حصہ کو بھی پیش نظر رکھ لیجئے جو ابن خلکان ہی میں مدونہ کے متعلق منقول ہے، یعنی سحنون اس مصححہ نسخہ اور ابن القاسم کے ایک مراسلہ کے ساتھ پھر اسد بن الفرات کے پاس مغرب لوٹے۔ ابن القاسم نے اسد کو لکھا تھا:

بقابل نسخته بنسخة سحنون فللذي تتفق عليه النسختان يثبت والذي يقع فيه	تم کو چاہیے کہ اپنے نسخہ کا سحنون کے نسخہ سے مقابلہ کرلو، جن باتوں پر دونوں نسخے متفق ہو

① وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۳۸۲: سحنون، ج: ۲، ص

الاختلاف فالرجوع إلى نسخة سحنون ويمحى عن نسخة ابن الفرات فهذه هي الصحيحة.

جائیں، ان کو باقی رکھا جائے اور جن باتوں میں اختلاف نظر آئے تو تم کو چاہیے کہ سحنون کے نسخہ کی طرف رجوع کرو اور ابن الفرات کے نسخہ سے وہ باتیں حذف کر دی جائیں کیونکہ صحیح یہی نسخہ یعنی سحنون والا ہے۔

لیکن اسد نے ابن القاسم کے اس حکم کی تعمیل نہیں کی۔ ابن حاجب نے جس سے یہ واقعہ سنا تھا اس نے عدم تعمیل کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اسد نے اسے اپنی توہین خیال کیا کہ شاگرد (سحنون) کی شاگردی قبول کریں، لیکن میں اسد جیسے عالم کے متعلق علمی تصحیح کی راہ میں ایسی چھوٹی ادنیٰ بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں بلکہ اصل واقعہ وہی معلوم ہوتا ہے کہ ''الاسدیہ'' کے جوابات میں بھی حنفیت کی عناصر شریک تھے، اور ان ہی کو ابن القاسم نے خارج کرایا ہوگا، اسد ان کے نکالنے پر آمادہ نہ ہوئے، قاضی عیاض کے بیان میں جو یہ جز پایا جاتا ہے کہ سحنون نے علاوہ تصحیح کے کچھ ترتیب میں بھی ردوبدل کیا تھا، اور اس کے ساتھ

احتج لبعض مسائلها بالأثار من روايته من موطا ابن وهب وغيره.

مدونہ کے بعض مسائل کی دلیل میں انھوں نے ابن وہب کے موطأ کی ان آثار کو پیش کیا تھا جنہیں وہ روایت کرتے تھے۔

اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ بظاہر جن مسائل میں اسد نے اپنے عراقی اساتذہ کی رائے کو ترجیح دی ہوگی ان کو خارج کر کے مالکی نقطہ نظر کی آثار واحادیث سے تائید فراہم کی گئی ہوگی۔

افسوس ہے اسد بیچارے زیادہ اللہ بن الاغلب کے حکم سے یورپ کے مشہور جزیرہ سسلی ① کے

① موجودہ اٹلی کا ایک خودمختار علاقہ اور بحیرہ روم کا سب سے بڑا جزیرہ سسلی ہے، جس کے شہر سرقوسہ پر قاضی اسد بن الفرات نے حملہ کیا، لیکن شہر فتح ہونے سے پہلے قاضی صاحب کی وفات ہوگئی اور اُنہیں شہر سے باہر دفن کیا گیا۔ سسلی کا نقشہ اگلے صفحے پر ہے تاکہ سمجھنے میں آسانی رہے۔ (زاہد)

جہاد میں چلے گئے اور سسلی کے جزیرہ سرقوسہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے کہ ان کی اجل آ گئی، اور آج تک اس یوروپین جزیرہ کے ایک شہر بلرم میں وہ مدفون ہیں، کاش اگر یہ جہادی مہم پیش نہ آ جاتی تو اسد کی یہ کتاب جو میرے خیال کے حساب سے مالکی اور حنفی فقہ کی سنگم تھی، ''اسلامی قانون'' کے سلسلہ کی ایک عجیب کتاب ہوتی، فوج میں شریک ہو جانے کے بعد علم کی دنیا سے وہ الگ ہو گئے اور مغرب کا علمی میدان سحنون کے ہاتھ آ گیا، سحنون اور ان کے ماننے والوں نے ''الاسدیہ'' کو بہت بدنام کیا، حتی کہ لوگوں نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ اسد نے ابن القاسم کے حکم کی جو تعمیل نہیں کی تھی اس کی خبر جب ابن القاسم کو ملی تو انھوں نے بد دعا کی مگر میرے خیال میں ''الاسدیہ'' کے متعلق ابن خلکان نے جو یہ لکھا ہے کہ:

فهجره الناس لذلك وهو الآن مهجور. اس لیے لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا اور آج تک وہ اسی طرح متروک ہے۔

اس کی بڑی وجہ وہی تھی کہ اس میں مالکی اساتذہ کی رایوں کے ساتھ ابن الفرات نے اپنے عراقی استادوں کی چیزیں بھی درج کی تھیں اور اسی چیز نے اس کا مغرب میں مقبول ہونے نہ دیا۔

تاہم کچھ بھی ہو مصر میں ابن الفرات سے پہلے حنفیت اگر پہنچی تھی تو قاضیوں کے ذریعہ سے لیکن علماء کے حلقوں میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مکتب خیال کے علمی نقاط نظر اور کتابوں کے پہنچانے کا کام سچ پوچھئے تو اسد بن الفرات ہی نے انجام دیا۔ ابتداءً مجھے جو کچھ کہنا ہے، چونکہ اسد کے اس کام کو بھی اس میں دخل ہے اس لیے ان کے اور ان کی کتاب کے متعلق مجھے ذرا تفصیل سے کام لینا پڑا، گویا علمی حیثیت سے مصر میں حنفی فقہ کا داخلہ پہلی دفعہ، اسد کے واسطہ سے ہوا، اور اب اس ملک کی حالت فقہی مکاتب خیال کے لحاظ سے یہ ہو گئی کہ امام مالک کے شاگردوں کا تو مصر پر ابتداء ہی سے قبضہ تھا، مالکیوں کے بعد امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تلامذہ کا دور آیا، اسی زمانہ میں

اسد بن الفرات نے حنفیت کو بھی علمی رنگ میں مصر اور مصر کے علماء سے روشناس کرا دیا۔

مصر میں شافعیت کا زور:

مصر اسی حال میں تھا کہ دوسری صدی کے اختتام پر یکا یک کل دس پندرہ سال کے عرصہ میں امام مالک کے جتنے بڑے بڑے شاگرد تھے یکے بعد دیگرے تھوڑے وقفہ کے ساتھ دنیا سے اٹھتے چلے گئے، سب سے پہلے ابن القاسم ① المتوفی ۱۹۱ھ، ان کے بعد ابن وہب ② المتوفی ۱۹۷ھ، ان کے بعد اشہب ③ المتوفی ۲۰۴ھ، ان کے بعد عبداللہ بن الحکم ④ المتوفی ۲۱۴ھ، گویا مصر میں جن ستونوں پر امام مالک کے علم کا ایوان قائم تھا، چند ہی سالوں میں ایک ایک کر کے گر گیا، اور اتفاق دیکھئے کہ ان ہی چند سالوں کے اندر حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی رحلت فرما گئے، ان کی وفات ۲۰۴ھ میں اسی سال ہوئی جس سال اشہب کا انتقال ہوا، اور یہی وہ اتفاق تھا، جس نے مصر میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کی جگہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ کے لیے میدان خالی کر دیا۔ خصوصاً امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے جن شاگردوں کا میں پہلے تذکرہ کر آیا ہوں، یعنی البویطی، ابن ربیع المؤذن، المزنی، حرملہ، اب مصر میں ان بزرگوں کا طوطی بولنے لگا، اور مالکیت کے مقابلہ میں شافعیت کا جھنڈا زیادہ بلندی پر اڑنے لگا، جس کے مختلف اسباب تھے، سب سے بڑی وجہ تو ان بزرگوں کی ذاتی خصوصیتیں تھیں، میرے لیے یہ تفصیل کا موقعہ نہیں ہے، لیکن البویطی کی داستان

---

① ابن القاسم کا ذکر متعدد بار آچکا، سحنون مغرب میں اور اصبغ مصر میں ان ہی کے مالکی خلفاء تھے۔

② ابن وہب کی حیثیت فقہ مالکی میں وہی ہے جو حنفی فقہ میں قاضی ابو یوسف کی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اجلہ اصحاب میں تھے۔ ''الفقیہ'' کا لفظ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ان کے سوا کسی کو نہیں کہتے تھے، فقہ کے ساتھ حدیث کے بھی امام تھے۔ ایک لاکھ حدیثیں روایت کیں، قیامت کے مصائب پر ایک کتاب لکھی تھی، یہ ہی کتاب ان کے سامنے پڑھی جا رہی تھی، چیخ کر بیہوش سے ہو گئے، پھر وفات تک کچھ نہ بولے۔

③ اشہب کا حال گذر چکا۔ ④ عبداللہ مصر میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے آخری شاگرد تھے۔

ثبات واستقلال سے تاریخیں معمور ہیں، خلق قرآن کے مسئلہ میں ان پر کیا کیا مظالم نہیں توڑے گئے، پابزنجیر مصر سے عراق لائے گئے اور قید خانہ میں وفات پائی، ہر جمعہ کو نہا دھو کر جیل کے دروازہ پر آتے، جیلر پوچھتا کہاں چلے، فرماتے ''نودی للصلوۃ'' کا حکم ہوا ہے وہ واپس کر دیتا، آسمان کی طرف سر اٹھا کر فرماتے:

اللهم إنك تعلم إني قد أحببت داعيك فمنعوني.①	پروردگار تو جانتا ہے کہ تیرے پکارنے والے کی آواز کو قبول کر کے چل پڑا، لیکن یہ لوگ اب مجھے روکتے ہیں۔

یہی حال امام شافعی کے دوسر شاگرد ابن ربیع کا تھا، باوجود اس علمی جلالت قدر کے ساری عمر جامع فسطاط کی موذنی میں گذار دی اور اس لیے الموذن کے نام سے اب تک مشہور ہیں، اور امام مزنی تو مزنی ہی تھے، علم کا حال یہ ہے کہ ابن سریج جن کا ذکر گذر چکا ان کی کتاب ''مختصر'' کے متعلق فرماتے تھے۔

يخرج مختصر المزني من الدنيا عذراء لم يفتض.②	المزنی کی مختصر دنیا سے کنواری ہی چلی جائے گی جس کی دوشیزگی کا ازالہ کسی سے نہ ہوسکا۔

تقویٰ کا یہ حال تھا کہ گرمیوں میں بی تانبے کے پیالہ میں پانی پیا کرتے تھے، مٹی کے آبخوروں سے پرہیز تھا، جب وجہ پوچھی گئی تو فرمایا:

بلغني أنهم يستعملون السرجين في الكيزان والنار لا تطهرها.③	مجھے معلوم ہوا کہ کمہار کوزوں کے بنانے میں اپنے استعمال کرتے ہیں اور آگ ان کو پاک نہیں کرتی۔

① وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۸۳۵، ابو یعقوب البویطی، ج: ۳، ص رحمۃ اللہ علیہ۔

②، ③ وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۹۳، المزنی صاحب الشافعی، ج: ۱، ص رحمۃ اللہ علیہ 118

ادھر تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کا یہ حال تھا اور دوسری طرف امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ کی وفات پھر ان مالکی ائمہ نے اپنے بعد مصر میں اولاً اپنی جیسی ہستیاں نہیں چھوڑیں، ایک دو تھے بھی تو مصر والوں پر ان کا مختلف وجوہ سے چنداں اثر نہ تھا، ان میں سب سے ممتاز اصبغ ہیں جن میں واقعہ یہ ہے کہ ابن وہب اور ابن القاسم امام مالک کے ان دونوں شاگردوں نے اپنا سارا علمی سرمایہ منتقل کر دیا تھا اور اسی لیے مالکیوں میں ان کا علمی مقام بہت بلند ہے لیکن ایک تو بیچارے کا تعلق شاید کسی ادنیٰ خاندان سے تھا، مصر کے والی نے ایک دفعہ شہر کے معززین کو اس لیے جمع کیا کہ کسی کو قاضی منتخب کریں، بعضوں نے اصبغ کا نام لیا حالانکہ مجلس میں اصبغ بھی موجود تھے لیکن ایک مصری امیر نے آگے بڑھ کر عرض کیا کہ:

أصلح الله الأمير ما بال أبناء الصباغين والمقاصر يذكرون في المواضع اللتي لم يجعل الله عزوجل لها أهلا. ①

اللہ امیر کو نیکی عطا کرے رنگریزوں اور دھوبیوں کی اولاد کو کیا ہو گیا ہے کہ ان کا ذکر ایسے مقامات میں کیا جاتا ہے جن کے لیے خدا نے ان کو اہل نہیں بنایا ہے۔

اصبغ گو یہ سن کر آپے سے باہر ہو گئے اور کہنے والے سے لڑ پڑے لیکن اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصریوں پر ان کی شخصیت کا کیا اثر تھا اور یوں بھی مؤرخین لکھتے ہیں کہ:

كان اصبغ خبيث اللسان لايسلم عليه أحد إنما كان لسانه صاعقة. ②

اصبغ زبان کے بڑے سخت تھے ان کی زبان سے کوئی نہ بچ سکا زبان کیا تھی بجلی کا کڑکا تھا۔

بھلا جس کے خاندان کے متعلق لوگوں کا وہ خیال ہوا اور پھر زبان بھی جن کی ایسی سخت ہو، پبلک پر ایسوں کا کیا اثر قائم ہو سکتا ہے اور وہ بھی امام شافعی کے ان پاک طینت قدوسی صفات تلامذہ

① کتاب الولاۃ وکتاب القضاۃ للکندی، عیسیٰ بن المنکدر، ص:۴۳۴۔

② کتاب الولاۃ وکتاب القضاۃ للکندی، حاشیہ ص:۴۳۴۔

کے مقابلہ میں نتیجہ یہ ہوا کہ مصر میں مالکیوں کا جتنا زور تھا، جہاں تک میرا اندازہ ہے اسی قدر ان اتفاقی واقعات کی بدولت ان کا اثر کم ہو گیا، قاضی ابن ابی اللیث کے دربار کے شاعر حسین الجمل نے اس معتزلی قاضی کو خطاب کر کے کہا تھا:

والمالكية بعد ذكر شائع أخملتها فكأنها لم تذكر ①

''مالکیہ کو اتنی عظیم شہرت اور مقبولیت کے بعد آپ نے ایسا گمنام کیا کہ گویا اب وہ قابل ذکر بھی نہ رہے۔''

اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہم جس زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں اس میں مالکیت پر یہ سانحہ مصر میں گذر رہا تھا، اگر چہ اس کی وجہ الجمل نے کچھ ہی بیان کی ہو مگر میرا تو خیال یہی ہے کہ گذشتہ بالا قدرتی واقعات ہی کا یہ نتیجہ تھا اور اب مصر تھا، وہاں کے مسلمان تھے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے یہی فقید المثال، عدیم النظیر صاحبان علم وفضل، تقویٰ و دیانت والے تلامذہ تھے، کچھ دن کے لے محمد بن ابی اللیث المعتزلی کی خباثتوں کی وجہ سے ان بزرگوں کو اس ملک میں شدید آزمائشوں میں خصوصاً خلق قرآن کی وجہ سے مبتلا ہونا پڑا جس کی طرف البویطی کے حالات میں کچھ اشارہ بھی کی اگیا ہے لیکن یہ آزمائشیں بھی

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے

بن کر رہیں۔

خصوصاً چند ہی دنوں کے بعد دیکھا گیا کہ المتوکل باللہ کے حکم سے یہی معتزلی مصر کے بازاروں می گدھے پر سوار کر کے اس طرح پھرایا جا رہا ہے کہ اس کے سر بلکہ ڈاڑھی کے بال بھی مونڈ دیئے گئے ہیں اور پیٹھ پر مسلسل کوڑے لگائے جا رہے ہیں، آستین کے لہو کی اس پکار نے مصر میں سنسنی

① کتاب الولاۃ وکتاب القضاۃ للکندی، محمد بن ابی اللیث الخوارزمی ص: ۴۵۲۔

پیدا کر دی اور عوام کی ان بزرگوں سے عقیدت اور زیادہ بڑھ گئی، گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ اب مصر صرف شافعیوں ہی کا ہو گیا، جیسا کہ میں نے بیان کیا تھا، البویطی تو درس وتدریس میں مشغول تھے اور ربیع المؤذن کے سپرد امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیفات کی اشاعت کا کام کیا تھا، وہ اس میں مستغرق تھے، عوام وخواص میں جو سب سے زیادہ نمایاں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سب سے زیادہ سربرآوردہ تھے وہ امام المزنی تھے، حتیٰ کہ آج بھی اہل علم کے گروہ میں شافعی اور شافعیت کے ذکر کے ساتھ لوگوں کا دماغ المزنی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور یہ حال تو اس ملک میں مالکیت وشافعیت کا تھا، رہی حنفیت تو جیسا کہ میں عرض کرتا چلا آ رہا ہوں، اب تک مصر میں زیادہ تر احناف حکومت وقضاء ہی کی راہوں سے آئے، صرف اسد بن الفرات نے ان کے علوم کو علم کے رنگ میں مصر ومغرب میں پہنچایا تھا اور جہاں تک میرا خیال ہے اسد کی وجہ سے مصریوں کی پرانی بدگمانی کہ ''حنفیت میں سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیدا ور داؤ پیچ کھیلا جاتا ہے''، اس میں بہت کچھ کمی ہو گئی تھی، اس طبقہ کے علماء کی کتابیں ملک میں پھیل چکی تھیں اور اہل علم کے مطالعہ میں رہتی تھیں، کاش کم از کم یہی حال باقی رہتا، لیکن ''بدنام کنندہ نیکو نامے چند'' یہی معتزلی جو قاضی ہونے پہلے مصر میں فرقہ معتزلہ کا رکن رکین تھا اور علانیہ اپنے ان ہی معتزلی دوستوں کے ساتھ وہ اس حال میں پایا جاتا تھا کہ:

معه نفر من أخوانه المعتزلة فأكل وشرب النبيذ فكان أجودنا شربا.①	وہ اپنے معتزلی احباب کے ساتھ ہوتا، کھاتا اور نبیذ پیتا اور اتنا پیتا کہ پینے میں سب سے آگے نکل جاتا۔

اور قاضی ہونے کے بعد تو ''النبیذ'' کے لفظ کا پردہ بھی اس نے ہٹا دیا فسق میں اتنا دلیر ہو گیا کہ:

① کتاب الولاۃ وکتاب القضاۃ للکندی، محمد بن ابی اللیث الخوارزمی، ص: ۴۶۷۔

يشرب "جلابا" في المسجد الجامع في مجلس حكمه.

''جلاب'' (نامی شراب)① جامع مسجد میں قضاء کے اجلاس میں پیتا۔

اس کے سوا اس نے الواثق باللہ کی پشت پناہی میں مسئلہ ''خلق القرآن'' کی آڑ لے کر جو مظالم مصر کے مالکی اور شافعی فقہاء پر توڑے اس کے سننے سے تو آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، یونس ابن عبدالاعلی جیسے محدث جلیل کو برسوں جیل کی سزا بھگتنی پڑی②۔ مشہور مصری صوفی بزرگ حضرت ذوالنون نے بھی اس کے ہاتھوں انتہائی مصائب جھیلے، البویطی کا حال تو گذر بھی چکا، جیسا کہ ابن خلکان نے لکھا ہے ان کے واقعات میں بھی اس کا ہاتھ تھا۔

خیر یہ واقعات تو اس زمانہ میں گذر ہی رہے تھے لیکن مصیبت یہ ہوئی کہ یہ ظالم معتزلی عقیدۃً تو معتزلی تھا لیکن جیسے زمخشری کے متعلق مشہور ہے کہ اعتقاداً معتزلی ہونے کے باوجود فروعاً حنفی تھا، بدقسمتی سے یہی حال اس ظالم وفاسق بدعقیدہ قاضی ابن ابی اللیث کا تھا، اس کے درباری شاعر الجمل نے جو مشہور قصیدہ اس کی تعریف میں لکھا ہے جس کا ایک شعر پہلے بھی نقل کر چکا ہوں اس میں ایک دوسرا شعر یہ بھی ہے:

فحميت قول أبي حنيفة تابع ومحمد واليوسفي الا ذكر

وزفر القياس اخي الحجاج الا نظر③

---

① نہایہ ابن اثیر اور قاموس دونوں میں جلاب کے معنی عرق گلاب لکھے ہیں، معلوم نہیں لائق مقالہ نگار نے جلاب کو از قسم شراب کیونکر بنا دیا۔ (برہان)

② متوکل کے زمانہ میں جب ابن ابی اللیث کے اور بلاکشوں کے ساتھ یونس کو بھی جیل سے رہا کیا گیا اور پوچھا گیا کہ یہ کیسا شخص ہے، بولے (ماعلمت فیہ الا خیرا) کہا گیا کہ اتنے دن تک آپ کو اس نے جیل میں سڑایا تو فرمایا لم یظلمنی ھو ولکن ظلمنی من شھد علی من عفی واصلح۔ کیسی عجیب شان ہے۔

③ یعنی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جو تابعی تھے ان کی تو نے تائید کی اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی اور یوسفی اقوال جو عام طور پر مشہور ہیں اور زفر کے اقوال کی جو بڑے قیاس کرنے والے اور صاحبِ نظر واحتجاج تھے۔

صرف یہی نہیں خود حنفی مؤرخین مثلاً عبدالقادر مصری صاحب ''جواہر مضیہ'' نے بھی

كان فقيها بمذهب الكوفيين.① ابن ابی اللیث کوفیوں کے طریق کا فقیہ تھا۔

کی تصریح کی ہے، غالباً جامع مسجد میں علانیہ برسر اجلاس اس کی ''شراب خوری'' حنفی مذہب کے مسئلہ ''نبیذ'' کی ممسوخ شکل تھی، ظاہر ہے کہ ابن ابی اللیث کے ان حالات نے مصر میں حنفیت اور حنفی فقہ، حنفی ائمہ کے وقار کو جو صدمہ پہنچایا اس کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا، بیچارے اسد بن الفرات کی ساری کوششوں پر پانی پھر گیا، شافعیوں کا حنفیت کی طرف سے یونہی دل کب صاف تھا، اور اس واقعہ ہائلہ نے تو امام شافعی کے شاگردوں کے دلوں میں نفرت بلکہ عداوت کے جذبات تک بھڑکا دیئے تھے۔

کہا جاتا ہے ایک دن یہی شرابی قاضی اجلاس پر جب آیا تو منہ پر رومال ڈالے ہوئے تھا لوگوں نے تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ رات مجلس نشاط بدمست ہوکر مسلمانوں کا یہ قاضی ارباب محفل سے الجھ پڑا، اوکسی دوسرے مست نے قاضی کی خوب خبر لی، اتنا مارا کہ چہرہ سوج گیا، اسی کو رومال سے چھپائے ہے، الکندی نے لکھا ہے:

فتواتر بخبر أنه عربد على شيخ كان ينادمه فشجه ذلك الشيخ.② یہ خبر متواتر طور پر مشہور ہوئی کہ کسی شیخ نے جو اس کا شراب خواری میں ہم محفل تھا جھگڑا شیخ نے اس کو زخمی کیا۔

مصریوں کے دل میں اس شخص کی جانب سے کتنی نفرت پیدا ہوگئی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ جب متوکل نے اس کو قضاء سے برطرف کیا تو:

وثب أهل مصر على مجلس ابن أبي الليث مصر والے ابن اللیث کی مجلس (نشست گاہ) پر

① الجواہر المضیۃ، باب المیم، ج:۲، ص:۳۹۔

② کتاب الولاۃ وکتاب القضاۃ للکندی، محمد بن ابی اللیث الخوارزمی، ص:۴۶۷۔

فرموا بحصره وغسلوا موضعه بالماء. ٹوٹ پڑے اور اس کی چٹائیوں کی باہر نکال کر پھینک دیا اور جہاں پر یہ چٹائیاں بچھی ہوئی تھی اس جگہ کو پانی سے لوگوں نے دھویا۔

بھلا جس بد باطن، شریر فطرت انسان نے برسر دربار جامع مسجد میں اہل السنّت کے علماء سے ان کی ٹوپیاں اپنے غلام سے اتروائی ہوں اور کیسی ٹوپیاں جو اس زمانہ میں بقول کندی:

كان ذي أهل مصر وجمال شيوخهم وأهل الفقه والعدالة منهم لباس انقلانس الطوال. اہل مصر کے لباس میں وہ ٹوپی داخل تھی، مصر کے شیوخ کا جمال ان ہی لنبی لنبی ٹوپیوں سے تھا، ان کے ارباب عدل وکردار وہی پہنتے تھے۔

گویا ان کی عزت کا وہ نشان تھی، الکندی نے لکھا ہے ابن ابی اللیث کے غلام اور عبدالغنی دونوں نے:

ضربا رؤس الشيوخ حتى ألقوا قلانسهم. مصر کے شیوخ کے سروں پر ضرب لگائی حتیٰ کہ ان کی ٹوپیوں کو سر سے اتار کر پھینک دیں۔

اور ان مقدس قلانس کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا کہ دیکھنے والوں کا بیان ہے:

رئت قلانس الشيوخ يومئذ في أيدي الصبيان والرعاع يلعبون بها.① شیوخ کی ان ٹوپیوں کو دیکھا گیا کہ ان دنوں لڑکے اور عام بازاری لوگ ان کے ساتھ کھیلتے ہیں۔

---

① کتاب الولاۃ وکتاب القضاۃ للکندی، محمد بن ابی اللیث الخوارزمی، ص: ۴۶۰، ۴۶۳۔

❁ کہتے ہیں کہ ابن ابی اللیث کے عہد ولایت میں مصر میں شدید قحط پڑا، سارا شہر جس میں قاضی بھی تھا استسقاء اور نیل کے افاضہ کے لیے باہر نکل گئے۔ ننگے سر ہو کر سب دعا مانگ رہے تھے، قاضی نے بھی اپنی ٹوپی اتار کر سامنے رکھی، کسی منچلے نے ٹوپی اچک لی اور ایک نے دوسرے پر پھینکی اور لوگوں نے خود اس کے سامنے اس کی ٹوپی سے گیند کی طرح کھیل کر دل کی بھراس نکالی۔ (الکندی)

جہاں تک میرا خیال ہے، جن علماء کی یہ توہین کی گئی تھی ان میں مصر کے سب سے بڑے ہر دل عزیز امام المزنی بھی تھے، کیونکہ الکندی ہی نے یحییٰ بن عثمان کے حوالہ سے جو یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ:

لما عزل ابن أبي الليث ترك كثير من الشيوخ لباس القلانس منهم أبو أبراهيم المزني.①

جب ابن ابی اللیث معزول ہوا تو بہت سے شیوخ نے ان ٹوپیوں کا پہننا ترک کر دیا جن میں ابو ابراہیم مزنی بھی تھے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن "القلانس الطوال" کی یہ توہین ہو چکی تھی ان کو جن لوگوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا تھا، ان میں المزنی بھی تھے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جس لباس کی اتنی بے عزتی ہو چکی تھی کوئی باغیرت آدمی اس کا پہننا کیسے اختیار کر سکتا تھا۔ گویا ابن ابی اللیث کے ظلم کی ایک تاریخی یادگار تھی جس کو علماء نے اس کے معزول ہونے کے بعد بھی باقی رکھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ دور مصر پر آیا اور گذر گیا، لیکن اس ظالم قاضی کا انتساب جو حنفی فقہ کی طرف تھا، اس نے مصریوں کے عوام وخواص کے دل میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی جماعت، ان کے مکتب خیال کی جانب سے شدید قسم کی نفرت وعداوت کا تخم بو دیا اور آئندہ یہی واقعہ آنے والے واقعات کی بنیاد بن گیا۔

قاضی بکار بن قتیبہ:

ہوا یہ کہ ابن ابی اللیث کی معزولی کے بعد خلیفہ متوکل کی طرف سے چند دنوں کے لیے تو مصر کے قاضی حارث بن مسکین رہے، لیکن حارث کے بعد زمانے نے پھر ایک کروٹ لی اور مصر کے مذہبی ماحول میں ایک نئی ہل چل کا آغاز ہوا، میری مراد مشہور حنفی قاضی بکار بن قتیبہ سے ہے۔

① کتاب الولاۃ وکتاب القضاۃ للکندی، محمد بن ابی اللیث الخوارزمی، ص:۴۶۱

حارث بن مسکین کے بعد ۲۴۶ھ میں خلیفہ متوکل نے مصر کی ولایت قضاء پر آپ ہی کا تقرر کیا۔ قاضی بکار چونکہ صرف قاضی نہیں تھے بلکہ اس کے ساتھ علاوہ اپنے غیر معمولی تقویٰ و دیانت کے جس کی وجہ سے عموماً مؤرخین (من التالین لکتاب اللّٰہ والباکین ①) کے شاندار الفاظ میں ان کا ذکر کرتے ہیں، زبان اور قلم دونوں کے مالک تھے، ان کے تعلیمی و تدریسی ذوق کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آخر میں احمد بن طولون حاکم مصر نے جب ان کو جیل بھیج دیا تو طلبہ علم کے شدید ہنگامے سے مجبور ہوکر ابن طولون نے قید خانہ کے ایک ہال میں ان کی تدریس کا انتظام کر دیا اور وہیں بیٹھ کر یہ درس حدیث وفقہ ایک مدت تک دیتے رہے ان کا اصلی وطن بصرہ تھا اور آنحضرت ﷺ کے مشہور صحابی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اولاد میں تھے، قاضی ابو یوسف اور امام زفر بن الہذیل مشہور حنفی ائمہ کے شاگرد رشید ہلال الرای جن کی کتاب الوقف حال ہی میں مطبع دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی ہے، بکار کی تعلیمی زندگی کا زیادہ زمانہ انھیں کے حلقہ درس میں گذرا تھا، جو اپنے وقت میں فقہ حنفی کا بصرہ میں سب سے بڑا اور مستند ترین علمی حلقہ تھا اور اسی لیے ان پر حنفیت غالب تھی بلکہ کہنا چاہیے کہ حنفیت میں غلو کی حد تک پہنچے ہوئے تھے، حالانکہ علاوہ ہلال الرای کے انھوں نے مشہور محدث ابوداؤد الطیالسی اور یزید ابن ہارون جو بخاری کے راویوں میں ہیں ان سے بھی حدیث کی تعلیم پائی تھی، لیکن اصلی رنگ ان کا وہی تھا جو ہلال الرای کی صحبت میں چڑھا تھا، یہ جس زمانہ میں مصر پہنچے ہیں اس وقت ملک میں حنفیت کے خلاف ابن ابی اللیث کی حرکتوں کی وجہ سے سخت ہیجان برپا تھا، ابن ابی اللیث کے بعد قاضی حارث بھی فقہ احناف کے ہمدردوں میں نہ تھے اگرچہ شوافع سے بھی ان کا دل صاف نہ تھا، الکندی نے لکھا ہے:

أمر الحارث بإخراج أصحاب أبي حنيفة — حارث نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے لوگوں کو مسجد سے

① اللہ کی کتاب پڑھنے والوں اور رونے والوں میں تھے۔

من المسجد و أصحاب الشافعي.① نکل جانے کا حکم دیا اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے لوگوں کو بھی۔

مصر میں یوں ہی حنفیوں کی تعداد کیا کم تھی، لیکن گذشتہ بالا وجوہ واسباب سے تھوڑی بہت جوان کی جماعت تھی، ان کے ساتھ حارث نے یہ سلوک کیا تھا اور یہ تو خیر حارث کا ذاتی فعل تھا لیکن ابن بی اللیث کی وجہ سے تو تقریباً ملک کا اکثر حصہ عوام کا ہو یا خواص کا حنفیت کے مخالف جذبات سے بھرا ہوا تھا۔

حنفی فقہ اور حنفی مجتہدات پر سخت تنقیدیں مصری علماء کا ایک طبقہ کر رہا تھا اور ان کے سرخیل مصر کے سب سے بڑے شافعی امام المزنی تھے، علاوہ اس عام رقابت کے جو عموماً احناف اور شوافع میں تھی، مزنی کی اس مخالفت میں ابن ابی اللیث کے اس طرز عمل کو بھی دخل تھا جس کا تماشہ بلکہ تجربہ علماً وعملاً مصر والوں کو ابھی چند دن پہلے ہوا تھا، قاضی بکار جس وقت یہاں قاضی ہوئے تو اس ملک کو انھوں نے اسی حال میں پایا، خصوصاً ان کی نظر جب المزنی کی کتاب ''المختصر'' پر پڑی تو جیسا کہ مصر کے مشہور قدیم مؤرخ ابن زولاق کا بیان ہے②۔ تو انھوں نے دیکھا کہ مختصر میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تردید کی گئی ہے۔③ اگرچہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر رد کوئی نئی بات نہیں تھی، کیونکہ اس زمانہ میں علما خصوصاً محدثین کا ایک طبقہ تھا جو امام اور ان کے نظریات پر مختلف علاقوں میں تحریراً تنقیدیں کر چکا تھا، اسی زمانہ میں ابن ابی شیبہ نے اپنے ''مصنف'' میں ''کتاب الرد علی ابی حنیفہ'' کے مان سے ایک مستقل جزء کا اضافہ کیا تھا مگر سچی بات یہ ہے کہ یہ بیچارے سیدھے

① کتاب الولاۃ وکتاب القضاۃ للکندی، الحارث بن مسکین، ص:۴۶۹

② الکندی کی تاریخ الولاۃ والقضاۃ کا تکملہ ابن زولاق ہی نے کیا ہے اور قاضی بکار ہی کے ترجمہ سے ان کا تکملہ شروع ہوتا ہے۔

③ الجواہر المضیہ بحوالہ ابن زولاق، ج:۱، ص:۱۶۹۔

سادھے کسی محدث کی تنقید نہ تھی بلکہ اس شخص کی تھی جس کے متعلق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ یہ پیش گوئی کر کے مرے تھے کہ:

لتذکرن زمانا تکون فیه أقیس أهل زمانك. اس زمانہ کو یاد کروگے جب تم اپنے زمانہ کے سب سے بڑے قیاس کرنے والے ہوگے۔

اور واقعہ بھی یہی تھا کہ ابوابراہیم المزنی صرف محدث نہیں تھے بلکہ ان کی قیاسی قوت، اور استدلالی سلیقہ حنفیوں سے کچھ کم نہ تھا، آخر کوئی بات ہی تھی جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے علاوہ مذکورہ بالا فقرہ کے ان کی اصابت فکر کا اندازہ کرتے ہوئے ایک دفعہ یہ جملہ فرمایا تھا کہ:

سیاتي علیه زمان لایفسر شیأ فیخطئه.① ایک وقت اس پر ایسا آئے گا کہ کوئی بات ایسی بیان نہ کرے گا جس میں غلطی کی ہو۔

اور کتاب بھی ان کو وہ جو صرف ان کی تصنیفوں ہی میں نہیں بلکہ علماء شافعیہ کے لٹریچر کے شہکاروں میں تھی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے جو اعتراضات حنفی نقاط نظر پر تھے② ان کی تعبیر اپنی خاص قابلیت سے جو المزنی نے کی تھی وہ معمولی نہیں تھی، کہیں اس سے پیشتر ابن سریج الامام کا جملہ اسی ''مختصر'' کے متعلق نقل کر چکا ہوں۔ جس میں انھوں نے اس کو (لم یقتض) کنواریوں میں شمار کیا ہے، قاضی بکار پر مختصر کی ان تیز و رسا تنقیدات کا جو اثر مرتب ہوسکتا تھا ظاہر ہے، کتاب کے دیکھنے کے ساتھ

① وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۲۳۳، الربیع بن سلیمان المرادی، ج: ۱، ص: ۲۳۱۔

② یہاں ایک خاص اصطلاح کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ قدماء خصوصا جس عہد کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس زمانہ میں طریقہ یہ تھا کہ استاد اپنے خیالات کا املاء کراتا تھا پھر ہر شاگرد اپنے اپنے ذوق اور استعداد کے مطابق استاد کے ان خیالات کی پرورش کرتا تھا اور عبارتوں کو بناتا کاٹتا تھا۔ یوں یہ کتابیں استاد اور شاگرد دونوں کی طرف منسوب ہو جاتی تھیں، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں اسی اصول کے تحت مرتب کی ہیں، لوگ امام محمد کی کتابوں کو کتب ابی حنیفہ کہتے ہیں اور کتب محمد بھی، اسی طرح مزنی، بویطی، ربیع المؤذن سب کے مختصرات ان بزرگوں کی طرف بھی منسوب ہیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی۔

بے چین ہو گئے۔ قاضی مصر ہونے کی حیثیت سے جو مطلق العنانہ اختیارات ان کو حاصل تھے اپنے پیش رووں خصوصاً ابن ابی اللیث کے مانند اگر چاہتے تو وہ بھی وہی راہ اختیار کر سکتے تھے جو ابن ابی اللیث نے اپنے مخالفین کے مقابلہ میں اختیار کی تھی کہ کسی کے متعلق معمولی بھنک اگر اس کے کان میں پڑ جاتی تھی کہ عقیدہ میں ہمارا مخالف ہے تو آپے سے باہر ہو جاتا تھا، الکندی نے لکھا ہے کہ بیچارے ہارون بن سعید الایلی کے متعلق ابن ابی اللیث کو کسی نے خبر پہنچائی کہ خلق قرآن کے مسئلہ میں تم سے ان کو اتفاق نہیں ہے، یہ سننا تھا کہ مطر غلام کو اس فرعونی دماغ کے قاضی نے اشارہ کیا، نصر بن مرزوق کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا ہارون بازار میں جا رہے ہیں اور

طيلسانه تحت عضده وعمامته في رقبته ومطر غلام ابن أبي الليث يسوقه بعمامته. ①

ان کی طیلسان تو بغل میں ہے اور عمامہ ان کی گردن میں اور ابن ابی اللیث کا غلام مطر ان کا عمامہ کے ساتھ پکڑے لیے جا رہا ہے۔

مگر یہ ایک معتزلی حنفی قاضی کا تجربہ تھا، اسی لیے مقابلہ میں ایک سنی حنفی قاضی بکار بن قتیبہ کو بھی دیکھئے، امام مزنی کی کتاب میں وہ اپنے واجب الاحترام امام اور ان کے تلامذہ کو اعتراضوں اور سخت تنقیدوں سے چھلنی پاتے ہیں مگر کیا کرتے ہیں، شاہد مخالف کے ساتھ مخالفت کی تاریخ میں غالباً بے نظیر واقعہ ہے کہ دیانتاً وہ محسوس فرماتے ہیں کہ المزنی نے امام شافعی کے حوالہ سے اس میں اعتراضات نقل کیے اور واقعہ کے اعتبار سے ان کو معلوم تھا کہ یہ اعتراضات امام شافعی ہی کے ہیں مگر یہ بات کہ اس کا شرعی ثبوت کیا ہے دینی ذمہ داریوں کے احساس کی نزاکت کی یہ آخری حد ہے کہ اپنے دو معتبر آدمیوں کو جن میں شہادت صادقہ کے ضروری صفات پائے جاتے تھے ان کو حکم دیتے ہیں۔

إذهبا واسمعا هذا الكتاب من أبي إبراهيم

تم دونوں جاؤ اور خود براہ راست ابوابراہیم مزنی

① کتاب الولاۃ وکتاب القضاۃ للکندی، محمد بن ابی اللیث الخوارزمی، ص: ۴۵۱

المزني. سے اس کتاب کو سن کر آؤ۔

اور صرف یہی نہیں کہ بس سن کر چلے آؤ بلکہ ابن ذولاق نے اس پر یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ قاضی بکار نے فرمایا کہ جب پوری کتاب المزنی سے براہ راست سن لو۔

فإذا فرغ منه فقولا له أنت سمعت الشافعي يقول ذلك. جب کتاب سے وہ فارغ ہو جائیں تب اس سے دریافت رکنا کہ کیا آپ ہی نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ وہ یہ باتیں فرماتے تھے۔

قاضی بکار نے حکم دیا کہ جب وہ اس سوال کا جواب اثبات میں دے چکیں تب میرے پاس تم دونوں آؤ اور باضابطہ طور پر (فاشهدا عليه) ان پر گواہی دو۔ دونوں گواہ المزنی کے پاس پہنچے۔

وسمعا من أبي إبراهيم المختصر وسئلاه أنت سمعت الشافعي يقول ذلك فقال نعم. دونوں نے ابوابراہیم سے مختصر سنی اور اس نے پوچھا کہ کیا آپ ہی نے امام شافعی سے یہ باتیں سنی ہیں مزنی نے کہا ہاں۔

پھر ٹھیک جن الفاظ میں گواہ عدالتوں میں اپنا اظہار دیتے ہیں ان ہی الفاظ میں قاضی صاحب کے سامنے ان لوگوں نے

شهدا على المزني أنه سمع الشافعي يقول ذلك. دونوں نے گواہی دی المزنی پر کہ امام شافعی سے انھوں نے یہ باتیں سنی ہیں۔

جب شہادت کی یہ ساری کاروائی مکمل ہوگئی تب اس وقت ''قاضی بکار'' نے کیا کیا؟ کیا ابن ابی اللیث المعتزلی کی طرح اپنے غلام کو آواز دی کہ المزنی کو گرفتار کر کے لے آؤ، دنیا حیرت سے سنی گی کہ شہادت کی یہ ساری کاروائی اس حنفی سنی قاضی نے محض اس لیے کی کہ آئندہ ان کا جو ارادہ تھا اس کی تکمیل میں شرعی ذمہ داریوں سے اپنے کو بری کر لیں، جو الفاظ اس کاروائی کے بعد قاضی بکار کی زبان پر جاری ہوئے، ابن زولاق کی روایت ان کے متعلق یہ ہے کہ قاضی نے فرمایا:

الآن استقام لنا أن نقول: "قال الشافعي". اب میرے لیے یہ درست ہوگا کہ میں کہوں امام شافعی نے یہ کہا ہے۔

گویا یہ سارا ساز وسامان اور یہ ساری تیاریاں صرف اس ایک حرف کی تصحیح کے لیے تھی یعنی شرعاً ''قال الشافعی'' کہنے کے وہ مجاز ہو جائیں، قضاء کے عہدے سے ایک ابن ابی اللیث المعتزلی نے بھی نفع اٹھایا تھا اور اسی قاضی بکار بھی استفادہ کرتے ہیں لیکن ایک دین کی تمام ذمہ داریوں کے توڑنے اور دوسرا انہی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے میں۔

بہرحال اس کے بعد ان مناظراتی یا تحقیقاتی سلسلہ کی تصنیفوں کی بنیاد پڑ گئی جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا کہ ان کا سلسلہ پھر صدیوں تک جاری رہا، ان زولاق کا بیان ہے کہ مذکورۂ بالا اعلان کے بعد قاضی بکار نے

رد على الشافعي هذا الكتاب. امام شافعی کی اس کتاب کی تردید کی۔

جہاں تک میرا علم ہے قاضی بکار کی یہ کتاب شاید اب دنیا میں موجود نہیں یا کسی کتب خانہ میں ہو، مجھے معلوم نہیں، البتہ عبدالقادر المصری صاحب طبقات نے اس کتاب کے متعلق لکھا ہے کہ قاضی بکار نے

صنف كتابا جليلا نقض فيه على الشافعي رده على أبي حنيفة.① ایک جلیل وسترگ کتاب قاضی بکار نے تصنیف کی جس میں انھوں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ان اقوال کی تنقید کی جن میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تردید کی گئی تھی۔

بہرحال جیسا کہ علماء کی شان ہونی چاہیے علم کا جواب قاضی نے کوڑوں سے نہیں دیا بلکہ اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ دونوں عالم حالانکہ ایک ہی شہر میں تھے، لیکن میرا خیال ہے کہ قاضی بکار

① الجواہر المضیۃ، باب الباء، ج:۱،ص:۱۶۹۔

چونکہ المزنی اوران کے استاد کرر دلکھ رہے تھے اس لیے شرم وحجاب سے مدت تک المزنی سے انھوں نے ملاقات بھی نہ کی اور یہ سارے معاملات غائبانہ ہی چلتے رہے، مگر خدا کی شان قاضی بکار کی ایک شرافت کا ثبوت قدرت کو پھر فراہم کرنا تھا، اتفاق یہ پیش آیا کہ کسی مقدمہ میں بحیثیت گواہ کے المزنی کو قاضی بکار کے اجلاس میں حاضر ہونا پڑا، علامہ عبدالقادر صاحب طبقات لکھتے ہیں کہ اس وقت تک قاضی بکار

لا یعرفه بوجهه إنما کان یسمع عنه ویتشوق له.

براہ راست ان کے چہرے سے قاضی بکار مزنی کو نہیں پہچانتے تھے صرف ان کا شہرہ سنتے تھے اور ملنے کا دل میں شوق رکھتے تھے۔

لیکن باوجود اشتیاق کے وہی حجاب مانع تھا، اگر یہ نہ ہوتا تو قاضی کو بھلا اپنے شوق کے پورا کرنے میں کونسی چیز مانع آ سکتی تھی، خصوصاً اس زمانہ کے قاضی کو کہ جس کو جس وقت چاہتا بلا سکتا تھا، خیر اب ہوا یہ کہ جب المزنی اجلاس میں قاضی صاحب کے سامنے آ گئے، دریافت کیا جناب کا نام کیا ہے، جواب ملا، اسمٰعیل المزنی (ابوابراہیم مزنی کی کنیت ہے، اصلی نام اسمٰعیل ہی تھا، وہی بتایا گیا) المزنی کے لفظ کا کان میں پڑنا تھا کہ قاضی بکار پر ایک عجیب حالت طاری ہوئی اور گھبرا کر دریافت کیا کہ المزنی صاحب الشافعی؟ بولے جی ہاں! قاضی صاحب نے اجلاس کے گواہوں کو جو خاص طور پر شناخت کنندگی کے لیے مصر کے ہر دارالقضاء میں رہتے تھے ان کو آواز دی اور پوچھا کہ اُھوھو (کیا واقعی یہ وہی المزنی ہیں) جب گواہوں نے کہا کہ جی ہاں یہ وہی المزنی ہیں تو شریف قاضی نے سر جھکا لیا اور جو کچھ انھوں نے ظاہر کیا بلا چون وچرا بغیر کسی جرح وقدح کے تسلیم کرلیا کہ ان کے علمی اور دینی مقام کے وہ جوہر شناس تھے، رقابت دونوں میں صرف علمی تھی، کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد اجلاس سے المزنی نکلے اوران کی زبان پر یہ فقرہ جاری تھا:

ستر اللّٰه القاضي سترني القاضي ستره الله.①

اللہ قاضی کے عیب کو ڈھانکے (جرح نہ کرکے) اس شخص نے میرے عیب کو ڈھانکا، اللہ ان کے عیب کو ڈھانکے۔

مطلب یہ تھا کہ جرح میں اگر چاہتے، بری بھلی باتیں پوچھ سکتے تھے لیکن ایک شریف علم دوست مقابل کا سامنا تھا، اس سے جو توقع ہوسکتی تھی وہی اس نے کیا، غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ یوں تو باہم ایک دوسرے سے الگ الگ رہتے تھے لیکن جب کبھی کسی مقام پر دونوں سے مٹ بھیڑ ہوجاتی، تو المزنی بھی قاضی کے احترام میں کمی نہیں کرتے تھے، ابن خلکان نے اس سلسلہ میں ایک واقعہ درج کیا ہے امام المزنی کی شرافت کا چونکہ اس سے اندازہ ہوتا ہے اس لیے غالباً یہاں اس کا نقل کرنا موزوں نہ ہوگا۔

واقعہ یہ پیش آیا کہ یوں تو ایک دوسرے سے حتی الوسع کنارے کنارے رہتے تھے، ایک دن کسی جنازہ میں دونوں اکھٹے ہوگئے غالباً تدفین میں کچھ دیر تھی، المزنی جن کی تقریری قوت اور استدلالی مہارت کا مصر میں زور تھا، قاضی بکار کو براہ راست ان کی زبان سے ان کی تقریروں کے سننے کا موقعہ نہ ملا تھا، خیال آیا کہ ذرا سنوں تو سہی کہ واقعی اس شخص کا کیا حال ہے، خود تو حجاباً براہ راست سوال کی ہمت نہ ہوئی، پاس میں جو آدمی التل نامی کھڑے تھے اس نے قاضی صاحب نے دریافت کرنے کے لیے کہا کہ حدیثوں سے ''نبیذ'' کی حرمت اور حلت دونوں ثابت ہیں پھر آپ لوگ (شوافع) حرمت ہی کو کیوں ترجیح دیتے ہیں۔

''نبیذ'' کا بدنام مسئلہ ایسا تھا کہ حنفیوں کے خلاف عوام کے جذبات کو بآسانی ابھارا جاسکتا تھا، لیکن بجائے کسی سخت و درشت الفاظ کے المزنی نے نہایت آسانی کے ساتھ دو لفظوں میں اس کا

① الجواہر المضیۃ، باب الباء، ج:۱،ص:۱۷۰۔

ایسا جواب دے دیا کہ گفتگو وہیں ختم ہوگئی، قاضی بکار بھی چپ ہوگئے، جواب یہ تھا کہ اس کا تو کوئی قائل نہیں کہ اسلام سے پہلے عرب میں ''نبیذ'' حرام تھی اور اسلام میں حلال ہوئی بلکہ سب ہی یہ مانتے ہیں کہ اسلام سے پہلے عہد جاہلیت میں وہ حلال تھی اور یہ بھی مسلم ہے کہ اسلام نے نبیذ کے متعلق جاہلیت کے حکم میں کچھ ترمیم ضرور کی اور وہ حرمت کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے اس لیے حرمت کی حدیثوں کو ہم ترجیح دیتے ہیں۔

قاضی ابن خلکان جو شافعی المذہب اور شافعیت میں تعصب بھی رکھتے ہیں انھوں نے المزنی کے اس جواب کو حرمت ''نبیذ'' کے متعلق (من الأدلة القاطعة) ''قطعی دلیلوں میں ہے'' قرار دیا ہے حالانکہ اگر نبیذ کے حرام ہونے کی قطعی دلیل یہی ہے تو اس کی قطعیت کا دعویٰ کرنا شاید نبیذ کے جواز کی دلیل بن جائے، آخر اتنی کمزور دلیل کو قطعی قرار دینے کے یہی معنی ہوسکتے ہیں کہ فریق کے پاس یہ یا اس سے زیادہ محکم دلیل اور کوئی نہیں ہے افسوس کہ اس وقت میرے موضوع سے یہ بحث خارج ہے ورنہ اس کی قطعیت پر بہت اچھی بحث ہوسکتی ہے اور اس دلیل سے خدا جانے کتنی حلال چیزیں حرام ثابت ہوسکتی ہیں اسی لیے میرا خیال ہے کہ امام مزنی کا یہ جواب محض ایک ٹالنے اور بحث کو ختم کردینے والا جواب تھا وہ قاضی بکار سے سن مکھ ہوکر احتراماً بحث نہیں کرنا چاہتے تھے، خصوصاً جب ان کے شریفانہ برتاؤ کا ان کو ایک دفعہ تجربہ ہو چکا تھا۔

③

بہرحال مجھے تو صرف مصر کی تاریخ کا ایک ورق پیش کرنا تھا اور اب ہم اس زمانہ تک آ گئے ہیں جہاں دیکھ رہے ہیں کہ اس ملک میں ایک حنفی اور ایک شافعی عالم میں مقابلہ کا بازار گرم ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں ایک اور واقعہ پیش آتا ہے اور اس واقعہ کو بیان کرنے کے لیے مجھے اتنی لمبی چوڑی تمہید کے بیان کرنے کی زحمت اٹھانی پڑی کیا کیا جائے۔ عام مؤرخین واقعات کو اتنی ناقص حالت میں بیان کرتے ہیں کہ اصل حقیقت کا اس سے پتہ نہیں چلتا، لیکن بحمداللہ بکھرے ہوئے منتشر حوادث و واقعات کو جہاں تک مجھ سے ممکن ہوسکا ہے میں نے انھیں ایک سلسلہ میں جوڑنے کی کوشش کی ہے، اور آب آمدم برسر مطلب۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا طلب علم کے لیے مصر آنا:

قصہ یہ ہے کہ مصر میں شافعیت اور حنفیت کے درمیان یہی عالمانہ کشتی ہو رہی تھی کہ عین ان ہی دنوں میں یا اس سے چند سال پہلے صعید مصر کے گاؤں طحا سے ہمارے امام ابوجعفر طحاوی جو اس وقت نوعمر تھے، مصر طلب علم کے شوق میں تشریف لائے، ان کی والدہ چونکہ امام ابوابراہیم مزنی کی بہن تھیں، اس لیے قدرتاً ان کی تعلیم کا موزوں ترین مقام خود اپنے ماموں کا گھر ہوسکتا تھا، چنانچہ یہ اپنی ماموں ہی کے پاس تعلیم میں مصروف ہوگئے، ابتدائی منازل طے کر چکنے کے بعد جب اُوپر کی کتابوں کے پڑھنے کا وقت آیا تو غالباً بڑی کتابوں میں اس وقت کے لحاظ سے شافعی مکتب خیال کے تعلیمی حلقوں میں مسند الشافعی جو نسبتاً شافعیوں کی کتابوں میں اس وقت آسان ترین کتاب تھی اپنے ماموں سے انھوں نے پڑھنی شروع کی۔ مسند شافعی میں بجائے مسائل اور مباحث کے صرف وہ حدیثیں جمع کر دی گئیں جنہیں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اپنی سند سے روایت کرتے

ہیں اور جو چھپ چکی ہے۔

یہ مسند شافعی وہ نہیں ہے جو عام طور پر مسند شافعی کے نام سے مشہور ہے اور جو مصر اور ہندوستان میں مسند الشافعی کے نام سے شائع ہو چکی ہے کیونکہ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف نہیں بلکہ ابو جعفر محمد بن مطر یا ابو العباس الاصم المتوفی ۳۴۶ھ اس کے جامع ہیں۔ صاحب الطبقات نے جس مسند الشافعی کا ذکر کیا ہے وہ سنن الشافعی ہے جس کو مزنی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے اور مزنی سے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اس کے راوی ہیں۔ یہ کتاب ۱۳۱۵ھ میں مصر سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے ماموں کے پاس ان کی تعلیم اسی کتاب پر ختم ہوگئی کیونکہ آئندہ جب مسند درس حدیث پر خدا نے ان کو پہنچایا تو المزنی سے صرف مسند الشافعی ہی روایت کرتے تھے جیسا کہ صاحب طبقات نے لکھا ہے:

تفقه أولا على خاله المزني وروى عنه مسند الشافعي①

طحاوی نے ابتداء میں اپنے ماموں سے تعلیم پائی۔ مزنی کے واسطہ سے وہ مسند شافعی کی روایت بھی کرتے تھے۔

ایک انقلاب آفرین واقعہ:

اور غالباً اسی زمانہ میں جب الطحاوی اپنے ماموں سے مسند الشافعی پڑھ رہے تھے حنفیت بلکہ فقہی دنیا کا وہ واقعہ پیش آیا جس نے سچ تو یہ ہے، کم از کم حنفی فقہ کے استدلالی طریقہ کا رخ بدل دیا، عام مؤرخین تو صرف اسی قدر لکھتے ہیں، صاحب ''جواہر المضیہ'' نے مشہور حنفی امام ابو الحسین القدوری کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

---

① الجواہر المضیۃ، باب الالف، ج:۱، ص:۱۰۳۔

كان أبو جعفر الطحاوي يقرء على المزني فقال له يوما "والله لاأفلحت" فغضب وانتقل من عنده.①

ابوجعفر طحاوی اپنے ماموں مزنی سے پڑھتے تھے ایک دن مزنی نے ان سے کہا کہ تو کامیاب نہ ہوگا بس اس پران کوغصہ آ گیا اور مزنی کے پاس سے ہٹ گئے۔

ابن خلکان نے بغیر کسی حوالہ کے اسی واقعہ کو بیان کرتے ہوئے بجائے "لا أفلحت" کے "والله لا جاء منك شئ" ② کے الفاظ نقل کئے ہیں، قریب قریب دونوں کا مطلب ایک ہی ہے، چونکہ پہلی روایت حنفی اسکول کے ایک ذمہ دار امام القدوری کی ہے، اس لیے اسی کو میں نے اختیار کیا ہے مگر قدوری کی روایت ہو یا ابن خلکان کی دونوں کی عبارت اتنی مجمل ہے کہ اس سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ یہ الفاظ طحاوی نے اپنے ماموں سے کسی خانگی مسئلہ میں سنے یا پڑھنے پڑھانے کے وقت کسی سوال یا نافہمی پران کو ڈانٹ پڑی لیکن اگر اس کو قرینہ قرار دیا جائے کہ عموماً اس واقعہ کا ذکر طحاوی کی تعلیمی حالت کو بیان کرتے ہوئے مؤرخین کرتے ہیں۔ اس سے غالب گمان ادھر ہی جاتا ہے کہ اس قصہ کا تعلق درس وتدریس ہی کے شعبہ سے ہے۔

اب اگر یہ مان لیا جائے اور اس کے ماننے کی کافی وجہ ہے تو آگے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ قصہ تھا کیا؟ کیا طحاوی نے کچھ پوچھا تھا اس پر المزنی بگڑ گئے، یا کسی بات کے سمجھنے میں الجھے، دیر ہوگئی، استاد کو غصہ آ گیا، خیر یہ تو ہوسکتا ہے، درس وتدریس کا جن کو تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ استادوں سے عموماً ایسی صورتوں میں شاگردوں کو کچھ سننا ہی پڑتا ہے مگر المزنی کا غصہ بھی اتنا کہ کچھ برا بھلا کہتے لیکن علم کے ایک طالب کو بددعا دینی اور وہ بھی المزنی جیسے محتاط، متقی آدمی کا، اور اس سے بھی، زیادہ حیرت انگیز یہ واقعہ کہ علامہ طحاوی کا اس پر بگڑ جانا، اور اتنا برہم ہو جانا کہ ہمیشہ

① الجواہر المضیہ، باب الالف، ج:۱، ص:۷۶۔

② تم سے کچھ بن نہ آئے گا۔

ہمیشہ کے لیے اپنے ماموں کے حلقہ سے الگ ہوجانا، یقیناً غور کرنے کی اور سوچنے کی بات ہے، آخر المزنی استاد تھے اور استاد بھی معمولی نہیں بلکہ ایسی شخصیت تھے جو ہزار بارہ سو سال سے مسلمانوں کے ایک بڑے حلقہ کی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد امام مانے جاتے ہے علاوہ ازیں آخر المزنی طحاوی کے حقیقی ماموں بھی تو تھے۔ باپ، ماموں، خالو جیسی بزرگوں کے غصہ کی بات پر لڑکوں کا بگڑ جانا اور اتنا بگڑ جانا کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر لینا، اس زمانہ میں جب خوردی اور بزرگی کے قوانین مغربی تمدن کے زیر اثر چنداں اہم نہیں رہے ہیں، ممکن ہے کہ چنداں قابل لحاظ نہ ہو لیکن ہم اسلامی تمدن و معاشرت کے جس عہد کا ذکر کر رہے ہیں، اس وقت یہ کوئی معمولی بات نہیں ہوسکتی اور اس سے آگے دلچسپ بات وہ ہے جس کا ذکر اس فقرہ کے بعد کیا جاتا ہے یعنی سب ہی لکھتے ہیں کہ ماموں کے ان لفاظ سے:

فغضب أبو جعفر من ذلك وانتقل من عنده وتفقه على مذهب أبي حنيفة.①

المزنی کی اس بات پر ابوجعفر کو بھی غصہ آ گیا اور ان کے یہاں سے الگ ہو کر ابوحنیفہ کی فقہ کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔

فرض کیجیے کہ طحاوی کو ماموں کی بات اتنی بری لگی تھی کہ ان سے تعلق توڑ لینے پر وہ مضطر ہو گئے لیکن اس کے لیے اپنے خاندانی مسلک کو ترک کرنے کی کیا ضرورت تھی، اگر اپنے ماموں سے پڑھنا نہیں چاہتے تھے تو اسی شہر میں خود ان کے مذہب کے بڑے بڑے علماء مثلاً البویطی، حرملہ، ربیع موجود تھے، خصوصاً جیسا کہ میں پہلے بیان کر آیا ہوں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مسند درس کے حقیقی خلیفہ تو البویطی ہی تھے، المزنی سے درس و تدریس کا اتنا تعلق بھی نہ تھا اور فرض کیجئے کہ کسی وجہ سے انھوں نے شافعی مسلک کو ترک کر دینے ہی کا ارادہ کیا ہو لیکن شافعیت کو ترک کر کے حنفیت ہی

① الجواہر المضیہ، باب الالف، ج:۱، ص:۷۶۔

اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔غور کرنے کی بات ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کے فقہ کے سیکھنے پر ان کو کس چیز نے مجبور کیا تھا، آخر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ قریب ترین تعلق رکھنے والے مالکی علماء بھی تو اسی شہر میں رہتے تھے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ابوالاساتذہ تھے۔جس شخص نے شافعیوں کو گود میں آنکھیں کھولیں، ان ہی میں ہوش سنبھالا، اور ان ہی کے دائرہ میں عمر کا کافی حصہ گذارا ہو، جیسا کہ انسانی نفسیات کا عام دستور ہے قدرتی طور پر ان ہی لوگوں کا رنگ اس پر چڑھ جاتا ہے۔خصوصاً جو رنگ بچپن میں چڑھا ہو، اچانک کسی معمولی وجہ سے متاثر ہو کر اس رنگ کا چھوڑنا یا چھوٹنا آسان نہیں ہے۔

دراصل یہی سوالات تھے جو عام مؤرخین کی اس مجمل رپورٹ سے حل نہیں ہو رہے تھے۔قطعی طور پر تو شاید کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن اسلام کے فروعی اختلافات کی تاریخ کے متعلق مصر کا جو ورق منتشر اور بکھری ہوئی سطروں کو جوڑ کر میں نے پیش کیا ہے، شاید اس کی رہنمائی میں ایک حد تک ہم اصل حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں میرا مقصد یہ ہے کہ مختلف حالات سے گذرتے ہوئے قاضی بکار کے عہد میں مصر فقہی مکاتب خیال کے اعتبار سے جس نقطہ پر پہنچا ہوا تھا اس کے علم کے بعد طحاوی نے اپنے شافعی استاد اور ماموں کو چھوڑ کر حنفی مذہب اور حنفی فقہ کے حلقہ ہائے درس سے جو تعلق پیدا کیا غالباً اب اس کا سمجھنا دشوار نہ ہو۔

ابن ابی اللیث حنفی معتزلی قاضی کے زمانہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ کا، المزنی کے دوست اور قدیم رفیق درس امام البویطی کا پابہ زنجیر مصر سے بغداد جانا، اور ان ہی بھاری بھاری بیڑیوں کے نیچے حالت اسیری وقید میں جان بحق ہونا، خود المزنی کی جامع مسجد میں بھرے اجلاس کے اندر دوسرے علماء ومشائخ کے ساتھ ابن ابی اللیث کے غلاموں سے اتنی ذلت اٹھانی کہ تھپڑ مار کر اِ علماء کے سر کی ٹوپیاں اڑائی جاتی ہیں اور شہر کے اوباش لڑکے ان سے گیند کھیلتے ہیں۔بھلا ان

واقعات وحوادث نے المزنی کے دل وجگر پر حنفیت کی جانب سے جو گہرے زخموں کے نشانات قائم کر دیئے تھے کیا وہ بھر سکتے تھے، مانا کہ قاضی بکار کے طرز عمل نے حنفیت کی جانب سے بہت کچھ صفائی کا مواد فراہم کر دیا تھا مگر انھوں نے بھی کیا کیا تھا، صرف یہی کہ ابن ابی اللیث کے سفلہ پن کی جگہ ایک اعلیٰ شریفانہ کردار کی حنفی مثال پیش کی تھی، لیکن مقابلہ اور رقابت کا سلسلہ تو پھر بھی باقی تھا، کوڑوں اور زنجیروں کا ذریعہ ختم ہو گیا تھا لیکن مقابلہ قلم کا حملہ تو جاری تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ قلمی حملہ کی ابتداء قاضی بکار ہی نے کی۔ خواہ وہ کتنے ہی جمیل اور محتاط رنگ میں ہو، ابن ابی اللیث کا قصہ تو ایک دن دو دن میں ختم ہو جاتا تھا لیکن قاضی بکار نے جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پر رد کرنے کے لیے اپنی کتاب جلیل لکھنی شروع کی ہوگی، ظاہر ہے کہ جو کچھ رات کو لکھتے ہوں گے، دوسرے دن اس کا ذکر اپنے تلامذہ اور حلقہ احباب واصحاب میں کرتے ہوں گے اور یہ چیزیں مسلسل امام المزنی تک پہچائی جاتی ہوں گی۔ آج فلاں مسئلہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ غلطی قاضی نے نکالی، فلاں مسئلہ میں ان کے علمی نقص کو ثابت کیا۔ یہ قصہ جہاں تک میرا خیال ہے برسوں جاری رہا، کیونکہ گو ابن طولون نے قاضی بکار کو آخر میں قید کر دیا تھا، لیکن پھر بھی المزنی کی زندگی میں قاضی بکار کو تقریباً گیارہ بارہ سال ایسے ملے ہیں جن میں ان کو ہر قسم کی فراغ بالی حاصل تھی، مالی فراغ بالی کو تو پوچھا ہی کیا تھا، مصر کے قاضی تھے اور اس پر ابن طولون ان کا حد سے زیادہ قدردان تھا۔ علاوہ ماہوار تنخواہ کے جو مصر کی طلائی اشرفی پونے دوسو ماہوار کے قریب تھی ہر سال ابن طولون ایک ہزار اشرفیوں کا توڑا بطور معمول کے دیا کرتا تھا اور اس پر لطف یہ تھا کہ قاضی صاحب کو اس پر بھی فخر تھا کہ:

ما حللت سراويلي على حلال.① جائز مقام پر اپنی شلوار میں نے نہیں کھولی ہے۔

① ملحقات للکندی، بکار بن قتیبہ، ص ۵۱۰۔

یعنی عمر بھر کنوارے رہے، ❁ بگاڑ سے پہلے ابن طولون کے پاس جاہ وجلال کا حال یہ تھا کہ طحاوی اپنی چشم دید شہادت بیان کرتے ہیں کہ:

ما أدري كم كان يجيئ أحمد بن طولون إلى بكار وهو على الحديث فما يشعر بكارا إلا وهو جالس إلى جنبه.①

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کئی دفعہ یہ صورت پیش آئی کہ احمد بن طولون قاضی بکار کے پاس آتا اور قاضی حدیث پڑھاتے رہتے تھے قاضی صاحب کو پتہ بھی نہیں چلتا، متنبہ ہوتے بھی تو اس وقت جب ابن طولون کو اپنے بغل میں بیٹھا پاتے۔

ایک معمولی مقدمہ میں ابن طولون کا فرمان ہوا کہ فلاں گھر کو قاضی نیلام کرادیں، قانونی طریقہ سے اس میں خود ابن طولن کے بیان کی ضرورت تھی، قاضی بکار نے صاف کہلا بھیجا: "حتی يحلف من له الدين" یعنی خود ابن طولون جب تک اجلاس میں آ کر قسم کھا کر نہ بیان کر جائے کہ ان کا بقایا ہے میں نیلام کا حکم نہیں دوں گا۔ راوی کا بیان ہے: "فحلف ابن طولون" (ابن طولون نے قسم کھائی) تب قاضی نے کہا: "الآن فقد أمرت بالبيع" (اب میں مکان کی بیع کا حکم دیتا ہوں) ابن طولون قاضی بکار کی کتنی ناز برداریاں کرتا تھا اگر اس کی تفصیل کی جائے تو بڑی طوالت ہوگی۔ حد یہ تھی کہ چونکہ ابن طولون زیادہ تر مقدمات کے فیصلے خود ہی کرتا تھا اور مصر میں ایسا رعب داب قائم کر رکھا تھا کہ مقدمات کی تعداد بھی اتنی گھٹ گئی تھی کہ:

❁ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ حارث بن مسکین قاضی کے گھر ایک دن قاضی بکار ملنے گئے، حارث عمر میں بڑے تھے، پوچھا میاں بکار تم پر کچھ قرض تھا یا بال بچے ہیں، یا حکومت نے زبردستی کی جو بصرہ چھوڑ کر اتنی دور مصر نوکری کرنے آئے۔ قاضی صاحب نے کہا ان میں سے کوئی بات نہیں، حارث نے سن کر کہا تو تم نے خواہ مخواہ مصر سے بصرہ تک بیچارے اونٹ کو تھکا دیا۔ حارث بڑے زاہد مزاج آدمی تھے، اس کے بعد بولے مجھے خدا کی قسم ہے جو تمہارے پاس کبھی آؤں، مطلب یہ تھا کہ پھر دنیا میں بلاضرورت مبتلا ہونے کی کیا حاجت تھی۔

① ملحقات للکندی، بکار بن قتیبہ، ص: ۵۰۸۔

حتى كان بكار ربما نعس في محله واتكا ثم انصرف إلى منزله ولم يتقدم إليه اثنان. ①

بسا اوقات قاضی اپنے اجلاس میں بیٹھے بیٹھے اونگنے لگتے اور ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے پھر گھر واپس ہوتے اس طور پر کہ وہ آدمی بھی ان کے سامنے پیش نہ ہوتے۔

گویا سرکاری کاموں سے ان کو فراغت تھی، اسیے موقعہ پر ظاہر ہے کہ بحث ومباحثہ کے سوا ان کا زیادہ مشغلہ اور کیا ہوگا، مزنی کی مختصر تھی اور اس پر ان کی تنقیدیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے جو کچھ قاضی لکھتے تھے یومیہ اس کی خبر المزنی کو پہنچائی جاتی تھی، علمی مباحث کا اس شخص تک پہنچنا آخر کیا مستبعد ہے، جس کی کتاب پر تنقید لکھی جا رہی تھی، جب لوگوں کا حال یہ تھا کہ معمولی معمولی مقدمات تک کے اظہار اور بیان کی رپورٹ مزنی کو پہنچا آتے تھے۔ کہتے ہیں کہ کسی نے شفعہ کا دعویٰ قاضی کے اجلاس میں دائر کیا، مدعی علیہ شافعی تھا اور دعویٰ شفعہ شرکت ملک کا نہیں بلکہ شرکت جوار (پڑوس) کا تھا جس سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک شفعہ کا حق پیدا نہیں ہوتا، مدعی علیہ اپنے امام کے خیال کی بنیاد پر شفعہ کا انکار کرتا تھا، قاضی صاحب نے اس کو حلف لینے کے لیے کہا، اس نے قسم کھا کر کہا کہ مدعی کو شفعہ کا حق حاصل نہیں ہے، قاضی نے کہا کہ قسم میں اتنا اور اضافہ کرو کہ جو لوگ جوار کے شفعہ کے قائل ہیں ان کے مسلک کی بنیاد پر بھی شفعہ کا اس کو حق نہیں ہے۔ اس اضافہ سے اس نے انکار کیا۔ قاضی صاحب نے مدعی کو ڈگری دے دی حالانکہ بات کتنی معمولی اور ہلکی ہے مگر چونکہ اس میں حنفیت اور شافعیت کے اختلاف کی ہلکی سی جھلک پائی جاتی تھی اس لیے اس شخص نے المزنی تک اس کی خبر پہنچائی، امام مزنی نے سن کر فرمایا ایک فقیہ قاضی کا سامنا تمہیں ہوا۔ ②

شافعیت وحنفیت کے قصہ کی جب اتنی معمولی بات بھی قاضی بکار کی المزنی تک پہنچائی جاتی تھی تو

① و ② ملحقات للکندی، بکار بن قتیبہ، ص: ۵۱۲ و ۵۱۳۔

قاضی کی ''کتاب جلیل'' جو گو بظاہر امام شافعی کی تردید میں تھی، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ان تردیدوں کی زیادہ زد المزنی کی ان جانکاہیوں اور محنتوں پر پڑتی تھی جو انھوں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نقاط نظر کی تعبیر میں اٹھائی تھی۔ ذہبی نے اپنی مشہور تاریخ ''دول اسلام'' میں قاضی ابوزرعہ کا فقرہ جو المزنی اور ان کی ''مختصر'' کے متعلق نقل کیا ہے کہ کسی نے ابوزرعہ کے سامنے کہا کہ مزنی نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بہت زیادہ علم حاصل کیا، ابوزرعہ نے کہا:

ما أكثر ما ظلم المزني للشافعي.① امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے مزنی پر کتنے ظلم ہوئے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ بیچارے مزنی کے کتنے کمالات ہیں جو واقعی ان کے تھے وہ لوگوں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کر کے ان پر ظلم کیا اور یہ بھی صحیح ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی وکالت کی وجہ سے مزنی کو مخالفین کے تمام حملے اپنے اُوپر لینے پڑے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ قاضی ابوزرعہ کا مشہور تاریخی فقرہ اپنے پیش رو قاضی بکار ہی پر شاید تعریض ہے اس لیے باوجودیکہ بویطی، ربیع وغیرہ سب کے مختصرات منسوبہ الی الشافعی موجود تھے لیکن اس مظلومیت کی تلافی کی صورت قاضی ابوزرعہ نے یہ نکالی تھی کہ صلائے عام دے دیا تھا:

من يحفظ مختصر المزني مائة دينار يهبها له.② جو مزنی کی مختصر کو زبانی ازبر کرے گا تو سو اشرفیاں قاضی ابوزرعہ اس کو دیں گے۔

گذر چکا ہے کہ قاضی بکار کی ''تصنیف جلیل'' کے لکھنے کا منشاء امام شافعی یا ان کے تلامذہ کی کوئی دوسری کتابیں نہیں تھیں بلکہ یہ سارا بخار مزنی کی ''مختصر'' ہی کو سامنے رکھ کر نکالا جا رہا تھا۔ اسی ''مختصر'' کے سننے کے لیے دو مستقل گواہ مزنی کے پاس بھیجے گئے اور گواہوں کے شرعی اظہار کے

① رفع الاصر عن قضاۃ مصر، رقم الترجمۃ: ۲۰۶، محمد بن عثمان بن ابراہیم بن زرعۃ، ص: ۳۹۱۔

② رفع الاصر عن قضاۃ مصر، رقم الترجمۃ: ۲۰۶، محمد بن عثمان بن ابراہیم بن زرعۃ، ص: ۳۸۷۔

بعد قاضی نے ''قال الشافعی'' کے دعوی کی شرعی تصحیح کر کے جس پر تیر اندازی کر رہے تھے آخر کار اس کی دکھن اپنے اندر محسوس کرنے لگے۔

میرا خیال ہے کہ معلومات بالا کو جو بھی بنظر تعمق پڑھے گا وہ میرے ساتھ اتفاق کرنے میں غالباً پس وپیش نہیں کر سکتا کہ مصر قاضی بکار کے عہدۂ قضا کے عہد میں (غیر شریفانہ، نامہذب اختلافات کا نہیں) بلکہ شائستہ باوقار عالمانہ مناظروں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، میرا اندازہ ہے کہ مصر پر یہ دور تقریباً گیارہ سال تک باقی رہا۔

اور یہی وہ وقت ہے جب ہمارے امام ابوجعفر الطحاوی علمی ارتقاء کے وسطانی زینوں پر قدم رکھ چکے تھے، غالب ہے کہ ''مسند الشافعی'' اور اس کے ساتھ فقہ شافعی کے استدلالی طریقہ کے ابتدائی خاکہ سے وہ واقف بنائے جا رہے تھے۔ سنین کے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عمر اس زمانہ میں سترہ اٹھارہ سال سے متجاوز ہو چکی تھی، ظاہر ہے کہ ان کے علمی مذاق کی ابتداء ایک ایسے ماحول میں شروع ہوئی جس میں صبح وشام حنفیت وشافعیت کے درمیان علمی میدان داری ہو رہی تھی۔ قاضی بکار تو ادھر اپنے ترکش کے تیز سے تیز تیر نکال نکال کر اپنی تصنیف جدید کے کمانوں سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی آڑ لے کر المزنی پر چلا رہے تھے، اگرچہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس تحریری مبارزت میں مزنی نے بھی قلم اٹھایا یا نہیں لیکن ہر وہ تیر جو قاضی کی طرف چلایا جاتا ہوگا، ممکن ہے کہ اگر تحریری نہیں تو مزنی کے حلقہ اصحاب واحباب میں تقریری طور پر اس کی مدافعت اور بازگشت کی آواز نہ سنی جاتی ہو۔ علم کا جو حلقہ ان مدافعانہ اور اقدامانہ آوازوں سے گونج رہا تھا ظاہر ہے کہ اس میں ابوجعفر طحاوی بھی شریک تھے بلکہ اور دوسرے شاگردوں کو رد وقدح، سوال وجواب، تردید وتنقید کا موقعہ صرف خاص اوقات ہی میں ملتا ہوگا، بخلاف طحاوی کے کہ المزنی کا گھر ہی ان کا گھر تھا۔ صبح وشام اٹھتے بیٹھتے ان کے کان میں ردوقدح وجدلیات کی ان آوازوں

کے سوا اور کیا آواز آتی ہوگی۔ خصوصاً ایسے گھرانوں میں جہاں علم کے سوا رہنے والوں کا کوئی دوسرا مشغلہ نہ ہو، جہاں تک کہ امام مزنی کے حالات معلوم ہیں ان کی زندگی کے چوبیس ۲۴ گھنٹے علاوہ ضروریات حیات ودین کے اسی مشغلہ میں بسر ہوتے تھے۔

امام طحاوی کی فطری افتادطبع:

اب اسی کے ساتھ آپ طحاوی کی خاص فطری نہاد اور افتادطبع کا بھی اندازہ کیجئے قطع نظر ان کے خاص ذہن وذکاء سوجھ بوجھ کے جن کا پتہ ان کی کتابوں کی ہر سطر اور ہر ورق سے ہر اس شخص کو مل سکتا ہے جس نے ان کی تالیفات کا تھوڑا بہت بھی مطالعہ کیا ہے اور انشاء اللہ اپنے مضمون کے دوسرے حصہ میں ہم اس کی مثالیں بھی پیش کریں گے۔ اسی وقادطبیعت، ثاقب ذہن اور اس کے ساتھ ساتھ جب نوجوانوں کی فطرت میں تسلیم وانقیاد کی جگہ کچھ اُپج اور اجتہاد کا بھی مادہ ہو تو اس کے جو نتائج ہو سکتے ہیں وہ ظاہر ہیں، طحاوی کی فطرت اور ان کے دل ودماغ کا طبعی رجحان کیا تھا، اس کا اندازہ اسی واقعہ سے ہوسکتا ہے جس کا ذکر امام طحاوی نے خود اپنی تاریخ میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

فطارت هذه الكلمة بمصر حتى صار مثلا.	مری یہ بات سارے مصر میں اڑ گئی یہاں تک کہ ضرب المثل بن گئی۔

قصہ یہ ہے کہ قاضی ابوعبید شافعی جن کا ذکر اپنے موقعہ پر آنے والا ہے، ان سے اور طحاوی سے مختلف اختلافی مسائل میں (شافعیہ حنفیہ) کے متعلق بحث ومباحثہ ہوتا رہتا تھا، طحاوی کہتے ہیں کہ کسی سوال کے جواب میں:

أجبته بمسئلة فقال لي ما هذا قول أبي حنيفة.	میں نے قاضی ابوعبید کو ایک مسئلہ کی صورت میں جواب دیا، قاضی نے کہا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا

مسلک تو یہ نہیں ہے۔

ابوعبید نے گویا ان پر یہ الزام لگایا کہ باوجود حنفی مسلک ہونے کے تم کو ایسے جواب دینے کا کیا حق ہے جو امام ابوحنیفہ کا مسلک نہیں ہے۔ ابوعبید کے اس اعتراض کا طحاوی نے جو جواب دیا اسی کا پیش کرنا مجھے مقصود ہے، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ طحاوی نے یہ اس زمانہ میں جواب دیا ہے جب ان کی عمر ۶۴، ۶۵ سال کے قریب تھی اور حنفی مسلک کی تائید میں اس وقت تک دفتر کے دفتر تیار کر چکے تھے، گویا حنفیت کا جتنا رسوخ کسی میں ممکن ہوسکتا ہے، عمر اور اشتغال دونوں کے اعتبار سے اس کی آخری منزلوں سے گذر چکے تھے لیکن جوانی کی ترنگ میں نہیں بلکہ بڑھاپے کے سکون و رسوخ کے بعد چھوٹتے منہ طحاوی کی زبان سے یہ جواب نکلتا ہے:

أيها القاضي أو كلما قال أبو حنيفة أقول به. قاضی صاحب کیا جو کچھ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہیں کیا ضروری ہے کہ میں بھی وہی کہوں۔

خیر یہاں تو بات پھر بھی ایک حد تک ٹھنڈی ہی ہے، ابوعبید نے طحاوی کے اس جواب پر جب یہ چبھتا ہوا نشتر لگایا:

ما ظننتك الا مقلدا. میں تو مقلد ہونے کے سوا تمہیں اور کچھ خیال نہیں کرتا تھا۔

اس وقت بوڑھے طحاوی کی زبان پر بے باک جوانوں کا سا یہ جواب بے ساختہ جاری ہوتا ہے طحاوی خود ہی راوی ہیں:

فقلت له هل يتقلد إلا عصبي. میں نے کہا کہ مقلد تو وہی ہوسکتا ہے جو متعصب ہو۔

ابوعبید نے طحاوی کی اس جرأت کو محسوس کر کے پھر کہا:

أو غبي.① یا وہ مقلد ہوتا ہے جو غبی ہو۔

① رفع الاصر عن قضاۃ مصر، باب حرف العین المہملہ، ص:۲۷۳۔

طحاوی اور ابوعبید دونوں کی زبانوں کی یہی بے ساختہ فقرہ:

هل يتقلد إلا عصبي أو غبي.

ملک کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک آگ کی طرح پھیل گیا۔ "حتی صار مثلا" اور لوگوں نے اس کو ضرب المثل بنا لیا (یہ واقعہ رفع الاصر کے حوالہ سے الکندی کے ملحقات سے ماخوذ ہے) طحاوی کا واقعی مطلب اس فقرہ سے کیا تھا مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ کہنہ سالی کے سکون اور طمانیت میں جس کی فطرت کا یہ حال ہو، جوانی کا گرم خون جب اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا اس وقت اس کے دل و دماغ جذبات و رجحانات کی کیا کیفیت ہوگی جس کی آزاد خیالی کا بڑھاپے میں یہ رنگ ہو، جوش شباب میں اس کی طبیعت کی منہ زوریوں، نفس کے ابا کا کیا حال ہوگا، مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابوجعفر طحاوی جس زمانہ میں اپنے ماموں المزنی کے زیر تعلیم تھے اور قاضی بکار و مزنی کے درمیان مقابلہ کا بازار گرم تھا، ہر روز قاضی کے حلقہ سے کسی نئے مورچہ پر حملہ کی جو خبر آتی ہوگی اور اس کی مدافعت میں المزنی کی طرف سے جو تیاریاں عمل میں آتی ہوں گی دونوں طرف کے مباحث میں قدرتی طور پر الطحاوی کا بھی حصہ لینا ناگزیر تھا۔ اسی سلسلہ میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ میں طحاوی کے غیر عصبی کھلے ہوئے آزاد دماغ نے قاضی بکار کہیے یا حنفی پہلو کی تائید میں کہیے کچھ اصرار کیا، ماموں نے ابتداء میں تفہیم سے کام لیا ہوگا لیکن جوان بھانجے کا اصرار اسی پہلو پر زور دینے میں بڑھتا رہا، طبعًا ایسے موقعہ پر جہاں نسبی طور پر خوردی بزرگی کا بھی رشتہ ہو، استاد کا برہم ہو جانا اور برہمی میں کچھ حد سے گذر جانا محل تعجب نہیں ہے اور یہی وقت تھا جس میں المزنی کی زبان سے طحاوی کی شان میں وہ الفاظ نکل پڑے جس سے مؤرخین "واللہ لا افلحت" (خدا کی قسم تو کبھی کامیاب نہ ہوگا) "واللہ لا جاء منک شئ" (خدا کی قسم تجھ سے کوئی کام نہ بن پڑے گا) ہوسکتا ہے کہ جوش کلام

میں طحاوی سے بھی ایسے الفاظ نکل پڑے ہوں جو المزنی یا امام شافعی وجہ ہوگئی ہو۔

بہرحال قرائن کا یہ اقتضا ہے کہ ماموں بھانجے میں یہ جھگڑا حنفیت اور شافعیت ہی کے اختلافی مسائل کے متعلق ہوا، اور اس جھگڑے کی بنیاد قاضی بکار کی وہ ''کتاب جلیل'' ہی تھی جس کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ ماموں سے اس علمی مقاطعہ کے بعد طحاوی بجائے اس کے کہ کسی دوسرے شافعی عالم یا مالکی فقیہ کے پاس جاتے، وہ سیدھے علماء احناف کے حلقوں میں جا کر شریک ہوگئے اور گو اس سلسلہ میں انھوں نے متعدد حنفی علماء سے استفادہ کیا لیکن ان اساتذہ میں ان کا جو تعلق قاضی بکار سے رہا غالباً دوسروں سے اتنی خصوصیت حاصل نہیں ہوئی، ذہبی نے اپنی کتاب ''سیر النبلاء'' میں قاضی بکار کے تلامذہ کا ذکر کرتے ہوئے جہاں طحاوی کا نام لیا ہے ان الفاظ کا بھی اضافہ کیا ہے:

وأكثر عنه الطحاوي جدا.① قاضی بکار سے طحاوی نے بکثرت روایت کی ہے۔

ذہبی کے اس قول کی تصدیق ان کی مرویات سے ہوتی ہے اور صرف علمی استفادہ نہیں بلکہ قاضی بکار کی پاسداری میں جیسا کہ میرا خیال ہے اپنے حقیقی ماموں اور ان کی مادی اعانتوں کو چونکہ چھوڑنا پڑا، اسی کی تلافی قاضی بکار نے یوں کی کہ طحاوی کو اپنا سکریٹری بنا لیا عبدالقادر المصری نے اپنے طبقات میں تصریح کی ہے:

وكان كاتبا للقاضي بكار بن قتيبة.② طحاوی قاضی بکار بن قتیبہ کے سکریٹری تھے۔

بلکہ میرا گمان تو یہ ہے کہ ماموں سے الگ ہونے کے بعد قاضی بکار جو اہل وعیال کے جھگڑوں

① ملحقات للکندی، بکار بن قتیبہ، ص:۵۰۵۔

② الجواہر المضیہ، باب الالف، ج:۱، ص:۱۰۳۔

سے آزاد تھے انھوں نے جوہر صالح پا کر طحاوی کو اپنی سرپرستی میں لے لیا، واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسا عام طور پر کیا کرتے تھے، عامر بن عبداللہ کا حال آگے آئے گا کہ وہ قاضی صاحب کا پروردہ تھا اور غالباً امام طحاوی قاضی بکار ہی کے اشارہ سے پہلے تو مصر ہی میں ایک قدیم حنفی عالم جن کا نام احمد بن ابی عمران موسیٰ تھا اور جو قاضی ابو یوسف محمد بن حسن کے مشہور شاگرد وخلیفہ محمد بن سماعہ کے تلمیذ تھے، ان سے پڑھنے کا حکم دیا اور اس کے بعد ان کو قاضی بکار ہی نے شام بھیج دیا وہاں طبقہ احناف کے ایک ماہر فن مولوی عالم عبدالحمید ابو خازم سے ان کے خاص علوم کے سیکھنے کو موقعہ دیا جن کا حاصل ہونا اس زمانہ میں ہر شخص کے لیے آسان نہ تھا، تاریخوں میں لکھتے ہیں کہ ابو خازم اس زمانہ میں علاوہ عام علوم دینیہ کے:

كان عالما بالفرائض والحساب والذرع والقسمة حسن العلم بالجبر والمقابلة وحساب الدور وغامض الوصايا والمناسخات.①	وہ فرائض اور حساب ذرع (پیائش) قسمت کے عالم تھے اور جبر ومقابلہ دور کے حساب وصایا کے اسرار اور مناسخات کا بھی اچھا علم رکھتے تھے۔

یہ خیال کہ طحاوی شام قاضی بکار کی سرپرستی میں گئے، اس کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ اپنے ماموں المزنی سے الگ ہونے کے بعد جہاں تک معلوم ہوتا ہے ابوجعفر طحاوی کی مالی حالت اچھی نہ تھی ابن خلکان نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ:

أبو جعفر الطحاوي كان صعلوكا.②	ابوجعفر طحاوی مفلس تھے۔

''صعلوک'' کا لفظ عربی زبان میں گویا انتہائی فقر وفاقہ کی حالت کو ظاہر کرتا ہے اس زمانہ میں حصول علم کی راہ میں مالی قربانیاں لوگوں کو دینی پڑتی تھیں، خصوصاً ان علوم کے لیے جن کے عالم

① الجواہر المضیہ، باب العین مع الباء، ج:۱،ص:۲۹۷۔

② وفیات الاعیان لابن خلکان، الطحاوی، ج:۱،ص:۴۴۔

ابوخازم عبدالحمید تھے وہ معمولی نہ تھیں، غالباً قاضی بکار چونکہ ان کو اپنا سکریڑی بنانا چاہتے تھے اور محکمہ قضا کے سکریڑی کے لیے علوم مذکورہ بالا کا جاننا ضروری تھا اس لیے ان کو پہلے انھوں نے ابوخازم کے پاس بھیج دیا، چونکہ فقہ ابی حنیفہ کی تکمیل تو طحاوی ابن سامعہ کے ایک جلیل القدر شاگرد احمد بن ابی عمران سے کر چکے تھے، جب دنیاوی علوم، نیز مواریث فرائض ووصایا کا فن ابوخازم سے حاصل کر کے اب وہ مصر لوٹے تو محکمہ قضا کے کاتب ہونے کی صلاحیت پورے طور پر پیدا ہو چکی تھی قاضی بکار نے ان کو اپنے پاس نوکر بھی رکھ لیا اور جب تک موقعہ ملتا رہا قاضی بکار سے طحاوی فقہیات سے زیادہ حدیث کا علم حاصل کرتے رہے اسی لیے جیسا کہ میں ذہبی کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں کہ قاضی بکار سے زیادہ ہی نہیں بلکہ ''اکثر جدا'' کی شکل میں انھوں نے حدیثیں روایت کی ہیں اور جہاں تک میرا خیال ہے حنفی فقہ کے جدلیاتی حصہ کی تعبیر وتحبیر، تقریر وتاویل میں طحاوی نے جو ید طولیٰ حاصل کیا۔ اس میں زیادہ تر قاضی بکار ہی کی صحبت کو دخل ہے، فقہ کے اس حصہ پر غور وفکر اور مشق کا موقعہ ان کو اس لیے اور زیادہ میسر آیا کہ اس زمانہ میں مختصر المزنی کے مقابلہ میں قاضی بکار اپنی ''کتاب جلیل'' کے ساتھ مصروف تھے اور کیا عجب ہے کہ اس سلسلہ میں بھی وہ اپنے جوان سکریڑی سے کام لیتے ہوں، طحاوی کے ساتھ قاضی بکار کی مہربانیوں میں ہوسکتا ہے کہ اس علمی رقابت کو بھی دخل ہو، جو المزنی سے ان کو تھی گویا جسے المزنی نے گرایا تھا وہ اسے اٹھانا چاہتے تھے، یوں سمجھئے کہ ان دونوں عالموں کی اس رقابت نے علامہ طحاوی کا کام بنا دیا۔ دین وعلم ودنیا تینوں چیزیں انھیں حاصل ہوگئیں۔

لیکن افسوس یکا یک عباسی حکومت میں ایک سیاسی فتنہ کھڑا ہوا، جس کی داستان طویل ہے، خلاصہ یہ ہے کہ عباسی حکومت کا خلیفہ اب معتمد تھا اور اپنے بھائی موفق کو اس نے ولی عہد باضابطہ تسلیم کر لیا تھا لیکن موفق پر حرص کا غلبہ ہوا اور معتمد کی زندگی ہی میں وہ تخت خلافت پر قبضہ کی کوشش کرنے

لگا۔ معتمد نے تمام اُمراء دولت سے اس سلسلہ میں امداد طلب کی، مصر کا حاکم احمد بن طولون جو قاضی بکار اور ان کے علم وفضل کا سب سے بڑا قدر شناس تھا، معتمد کی امداد کو کھڑا ہو گیا، موفق اس بنیاد پر ابن طولون سے بگڑ گیا۔ معتمد کو موفق شاہ شطرنج بنا چکا تھا، حکومت کے وسائل پر اس کا قبضہ تھا اس نے ابن طولون کی معزولی کا فرمان بھیج دیا اور ممالک محروسہ میں اس پر لعنت کرنے کا حکم دیا۔ ابن طولون کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی فوج لے کر مصر سے بغداد کی طرف چل پڑا، قاضی بکار بھی ساتھ تھے، دمشق میں ابن طولون کو معتمد کا فرمان ملا کہ موفق کو ولی عہدی سے ہم نے معزول کر دیا، اسی وقت ابن طولون نے تمام امراء واعیان قضاہ ومشائخ جو وہاں موجود تھے سب کو خلیفہ کے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے کہا۔ کہا جاتا ہے کہ سبھوں نے تعمیل کی لیکن قاضی بکار نے خلیفہ کو ''الناکث'' عہد شکن قرار دیا۔ یہ خبر ابن طولون کو پہنچی، قاضی کی طلبی ہوئی، امتحاناً اس نے موفق پر لعنت کرنے کا قاضی سے مطالبہ کیا انھوں نے انکار کر دیا، دونوں میں تو تو میں میں ہوئی، تا ایں کہ ابن طولون غصہ سے بھوت ہو گیا، اور قاضی بکار کا سارا وقار اس کے دل سے نکل گیا۔ پھر ابن طولون نے قاضی بکار کے ساتھ جو ناگفتہ بہ سلوک کیے، اس کے ذکر سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قاضی بکار کے بدن کے کپڑے پھڑوا کر اس نے اتروا لیے، صرف پائجامہ اور موزہ کے ساتھ قاضی صاحب ننگے بدن زمین پر لٹائے گئے اور ان کی دونوں ٹانگوں کو لمبی کرا کے آہنی اعصا سے ابن طولون نے مسلسل مارنے کا حکم دیا۔ ایک آدمی ان کی ٹانگیں پکڑے ہوئے تھا اور مسلسل مار پڑ رہی تھی، قاضی بکار پاؤں سمیٹ بھی نہیں سکتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ اس حال میں بھی اس بلند فطرت قاضی کے منہ سے ''اوہ'' سے زیادہ کوئی آواز نہیں نکلتی تھی اور اسی عریاں حال میں ان کو جیل خانہ پہنچا دیا گیا، جہاں وہ آخر عمر تک رہے۔ ابن طولون کی وفات ① کے

① کہتے ہیں کہ ابن طولون جب مرض الموت میں مبتلا ہوا تو قاضی سے معافی کے لیے آدمی بھیجا، انہوں نے کہلا بھیجا: ''میں

چالیس دن بعد قاضی صاحب کا بھی انتقال ہوگیا۔ظاہر ہے کہ اس انقلاب نے:

شد آں مرغ کہ خانہ زریں نہاد زمانہ دگر گوں آئین نہاد

نہ وہ ولایت قضاء رہی، نہ قاضی بکار کی سکریڑی اور کاتبین سب الگ الگ ہوگئے خود طحاوی کا بیان ہے کہ قاضی کے ایک ایک ملنے والے الگ ہوگئے، بلکہ ابن طولون کے اس اعلان پر کہ قاضی بکار پر جس کا جو کچھ مطالبہ ہو پیش کرے، طحاوی کہتے ہیں کہ دنیا جھوٹے دعوے لے کر ٹوٹ پڑی اپنی آنکھ دیکھی عبرت کا ایک واقعہ طحاوی ہی نے نقل کیا ہے کہ ایک نوعمر لڑکا عامر نامی جسے قاضی صاحب نے پالا تھا وہ بھی مدعیوں میں شریک ہوکر ابن طولون کے سامنے حاضر ہوا، قاضی صاحب کو ابن طولون جواب کے لیے دربار میں بلاتا تھا اور اپنے سامنے کھڑا کر کے جواب پوچھتا تھا، قاضی کی نظر جب اس پروردہ لڑکے پر پڑی تو بے اختیار ہوگئے، بولے عامر تم یہاں کیسے؟ عامر نے کہا تو نے مال برباد کیا اور آج پوچھتا ہے یہاں کیسے، طحاوی کا بیان ہے کہ قاضی کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل پڑے ''اگر جھوٹ بولتا ہے تو خدا تیری عقل سے تجھے نفع نہ پہنچائے'' خود امام طحاوی نے اس کے بعد دیکھا کہ وہ لڑکا مصر کی گلیوں میں دیوانہ وار مارا پھرتا تھا، لوگوں پر ڈھیلے پتھر پھینکتا تھا منہ سے ہمیشہ لعاب بہتا رہتا تھا جدھر نکل جاتا، لوگ پکار اٹھتے ''ہذہ دعوۃ بکار'' (یہ بکار کی بددعا کا اثر ہے) امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

ما تعرض له أحد فأفلح.① قاضی بکار کے ساتھ جو بھی الجھا وہ کامیاب نہ ہوسکا۔

طحاوی کے یہ سارے بیانات بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ قاضی بکار سے ان کا خاص تعلق تھا

پیر رفتہ ازکار اور تو بیمار خستہ وزار، اور ہم دونوں کی ملاقات کا دن قریب ہے، ہمارے اور تمہارے درمیان صرف حق تعالیٰ پردہ ڈالے ہوئے ہیں''، جب ابن طولون مرگیا، قاضی کو خبر دی گئی بولے، ''مسکین مرگیا''۔

① رفع الاصر عن قضاۃ المصر، حرف الباء، ج:۱،ص:۱۰۶۔

اپنے سرپرست ومحسن کے اس حال کو دیکھ کران کا دل روتا تھا اور خدا کی شان دیکھئے کہ بلندی کے طحاوی کو یہ پستی اپنے ماموں المزنی کی زندگی ہی میں دیکھنی پڑی کیونکہ قاضی بکار کے ابتلاء کے سات سال بعد المزنی نے وفات پائی:

وتلك الايم ندولها بين الناس.

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں علامہ طحاوی نے جو کچھ کمایا تھا سب ختم ہوگیا، یا ہوسکتا ہے کہ ایں ہم بچہ شتر است کے قاعدہ سے ان پر بھی مصیبت آئی ہو اور جو کچھ اثاثہ تھا ابن طولون نے چھین لیا ہو کیونکہ اس فتنہ کے بعد مؤرخین طحاوی کا جو حال بیان کرتے ہیں اس سے یہی معلوم ہوت اہے کہ پھر انتہائی فقر وتنگ دستی کے شکار ہوئے اور ان کی وہی ''صعلوکیت'' پھر واپس آ گی، اور مصیبت بلائے مصیبت یہ ہوئی کہ جب تک ابن طولون جیتا رہا، قاضی بکار کی نیابت① میں قضاء کا کام محمد بن شاذان جوہری سے لیتا رہا۔ لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ ابن طولون کا قاضی بکار سے چالیس دن پہلے انتقال ہو چکا تھا اور ابن طولون کے بعد اس کا بیٹا ابوالجیش خمارویہ گو اس کے بعد مصر کا والی ہوا لیکن ایسے سیاسی حالات پیش آئے کہ ایک مدت تک کسی قاضی کا تقرر ہی مصر کے عہدہ قضاء پر نہ ہوسکا، ابن زولاق کا بیان ہے کہ:

كان بين موت بكار وولائته فترة بقيت فيها مصر بغير قاض سبع سنين.②	قاضی بکار کی موت اور ان کی قضائت کے درمیان ناغہ ہونے زمانہ آیا یعنی سات سال تک مصر بغیر قاضی کے رہا۔

اور میرے خیال مین بھی جو چیز طحاوی کی پریشانی کا باعث ہوئی جب تک ابن طولون زندہ رہا

① نیابت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ قاضی بکار کا تقرر خود بارگاہ خلافت سے ہوا تھا اور ابن طولون جو مصر کا گورنر تھا اس کو موقوف کرنے کا اختیار نہ تھا۔

② ملحقات للکندی، بکار بن قتیبہ، ص: ۵۱۵۔

ظاہر ہے کہ اس وقت تک ان کو حکومت میں کیا عہدہ مل سکتا تھا بلکہ زیادہ قرینہ یہی ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن کو بھی پسنا پڑا ہوگا، اور جب ابن طولون مر گیا تو سات سال تک کوئی قاضی ہی مقرر نہ ہوسکا۔ طحاوی نے جو علم سیکھا تھا معاشی حیثیت سے وہ اگر نفع بخش ہوسکتا تھا تو قضاء ہی کے محکمہ میں اور بیچارے کو دنیا کا کوئی پیشہ ہی کونسا آتا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں امام طحاوی کو سخت مالی پریشانیاں اٹھانی پڑیں، اس لیے عموماً اس زمانہ کی تنگ دستیوں کا حال مؤرخین خلاف دستور اپنی کتابوں میں بیان کرتے ہیں۔

④

قاضی محمد بن عبدہ کا امام طحاوی سے سلوک:

لیکن خدا خدا کر کے عمر کے یہ دن پورے ہوئے اور سات سال بعد جب خمارویہ ابن احمد بن طولون نے قاضی محمد بن عبدہ بن حرب کا تقرر کیا تو خدا نے امام طحاوی کے دن پھیرے۔ محمد بن عبدہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کے مکتب خیال کے اسلامی قانون کے سلسلہ میں پیرو تھے اور یوں بھی امام طحاوی جن کو گویا قاضی بکار نے خاص قضاء کی سکریٹری شب کے لیے تیار کیا تھا، ان سے بہتر آدمی محمد بن عبدہ کو کون مل سکتا تھا، ابن خلدون کا بیان ہے:

فاستكتبه أبو عبيد الله محمد بن عبده القاضي.①

طحاوی کو ابو عبیداللہ محمد بن عبدہ قاضی نے اپنا سکریڑی مقرر کیا۔

یہی نہیں کہ عسر کے بعد طحاوی کو صرف ایک ملازمت ہی کی راہ سے ''یسر'' حاصل ہوا، بلکہ محمد بن عبدہ چونکہ ان لوگوں میں تھے جن کی سخاوت وجود کی داستان اب تک مؤرخین مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں، ان کے فقہ اور حدیث کے حلقوں میں جو لوگ آ کر شرکت کرتے تھے سب کو قاضی کھانا کھلاتے ہی تھے لیکن اس کے سوا ہر عید میں فسطاط (عاصمہ مصر) جیسے غدار شہر کی قاضی صاحب کی طرف سے اتنی بڑی دعوت ہوتی تھی کہ:

فلا يتأخر عنه أحد من وجوه البلد من فقيه ومتفقه وشاهد وصاحب حديث ووجوه الكتاب والقواد والتجار.②

ان کی دعوت سے کوئی پیچھے نہیں رہتا تھا یعنی شہر کے معززین میں جو فقیہ یا متفقہ (فقہ سیکھنے والے طلبہ) شاہد (گواہی جن کی معتبر ہوتی تھی یہ معزز لوگ شمار ہوتے تھے) حدیث والے اور ارباب

① وفیات الاعیان لابن خلکان، الطحاوی، ج:۱،ص:۴۴۔

② ملحقات للکندی، محمد بن عبدہ،ص:۵۱۶۔

انشاء میں جو ممتاز لوگ تھے یا فوجی افسر اور تجار سب ہی دعوت میں شریک ہوتے تھے۔

جود وسخا کا یہ حال ثروت و دولت کی یہ کیفیت کہ علاوہ خدم وحشم کے کہا جاتا ہے کہ مابین خصی وفحل، ان کے پاس سو سو غلام تھے، صرف مصر میں

بنی دار عظیمة كان يدعى أنه صرف عليها مائة ألف دينار.

ایک بڑی زبردست حویلی تیار کی تھی قاضی کا دعویٰ تھا کہ اس حویلی پر ایک لاکھ اشرفیاں خرچ آئی ہیں۔

حافظ ابن حجر وغیرہ کے حوالہ سے اسی مکان کے مصارف کا ایک اور حساب کتابوں میں درج ہے، اس کے لحاظ سے لوگوں کا تخمینہ ہے کہ:

فيكون مصروفها ضعف ما ذكر.①

اس کے لحاظ سے مصارف کا اندازہ دونا کرنا چاہیے۔

اور یوں تو محمد بن عبدہ نے پہلے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی قابلیت کی بنیاد پر نوکر رکھا تھا لیکن جوں جوں دونوں میں تعلقات وسیع ہوئے اور قاضی پر امام کے جوہر کھلنے لگے۔ پھر تو وہ ان کا عاشق زار ہو گیا ہر طریقہ سے قاضی کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ اس پریشان معاش، پراگندہ روزی عالم کی جہاں تک امداد ممکن ہو اس میں کمی نہ آنی چاہیے۔ اس لیے تنخواہ وغیرہ کی راہ سے جو کچھ دلاتے تھے وہ تو بجائے خود تھا، یوں بھی جو موقعہ ہاتھ آیا نفع پہنچانے میں کمی نہیں کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ابن طولون کے بیٹے خمارویہ والی مصر کے گھر میں کسی کا عقد تھا۔ قاضی محمد بن عبدہ بھی اپنے سکریٹری ابو جعفر طحاوی کے ساتھ اس محفل میں شریک تھے، بلکہ عقد خوانی کا کام طحاوی ہی کے ذریعہ انجام دلایا۔ نکاح کے رسوم جب ختم ہو گئے تو اندر سے خادم سر پر سینی لیے ہوئے سامنے

① ملحقات للکندی، محمد بن عبدہ، ص:۵۱۶۔

آیا۔ سینی میں طلائی دینار اور عطر کی شیشیاں تھیں آ کر آواز دی ''قاضی کی آستین بھرنے کے لیے بھیجا گیا ہے''۔ قاضی محمد بن عبدہ نے آواز دی میری آستین نہیں، ابوجعفر طحاوی کی آستین بھری جائے۔ خیر یہ تو اپنا حصہ تھا جو قاضی صاحب نے ابوجعفر کو ہبہ کیا، اس کے بعد اور دس سینیاں وہی سوسو اشرفیاں اور عطر کی شیشوں کی محکمہ قضا کے شہود کے لیے آئیں۔ قاضی صاحب کو اختیار تھا کہ اس میں سے جسے چاہیں عطا کریں، راوی کا بیان ہے کہ ہر سینی کے پیش ہونے پر كم أبي جعفر ہی کی ندا قاضی صاحب کی طرف سے آتی رہی اور امام طحاوی ہی کی آستین بھرتی رہی۔ آخر میں امام طحاوی کے نام کی سینی بھی آئی، وہ تو كم أبي جعفر کی تھی ہی، نتیجہ یہ ہوا کہ

فانصرف يومئذ بألف دينار ومائتي دينار سوى الطيب.①	اس دن کی مجلس عقد سے طحاوی ایک ہزار دوسو دینار علاوہ عطر کی شیشیوں کے لے کر واپس ہوئے۔

غالباً قاضی محمد بن عبدہ کے یہی دینے دلانے، بخشش وعطا کے واقعات ہیں جن کو ابن خلکان، حافظ ابن حجر، سبھوں نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

واستكتب ابن عبده أباجعفر الطحاوي وأغناه.	قاضی ابن عبدہ نے ابوجعفر طحاوی کو اپنا سکریٹری بنایا اور ان کو امیر کر دیا۔

گویا ایک عسر کے ساتھ دو یسر ہیں۔ اس آیت کی عملی تفسیر امام طحاوی اپنی زندگی میں پا رہے تھے۔

خمارویہ طولون کی عقیدت امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ سے:

اور خود قاضی ہی نہیں بلکہ خمارویہ ابن طولون کا بیٹا جواب ارض فرعون کا وارث و مالک تھا وہ بھی امام طحاوی پر کم مہربان نہ تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی مہربانی کے حاصل کرنے میں امام طحاوی کی ایک حکمت عملی کو بھی دخل تھا۔ قصہ یہ ہے کہ کسی مقدمہ میں خمارویہ کی طرف سے محکمہ قضاء میں

① ملحقات للکندی، محمد بن عبدہ، ص: ۵۱۷۔

چند لوگوں کی گواہیاں گذرنے والی تھیں جن میں منجملہ اور گواہوں کے امام ابوجعفر طحاوی بھی تھے اور بیچارے گواہ سیدھے سادھے تھے۔شہادت نامہ پر دستخط کرتے ہوئے سبھوں نے یہ عبارت جو مروج تھی درج کی:

أشهدني الأمير أبو الجيش خمارويه بن أحمد بن طولون مولى أمير المومنين على نفسه.

امیر ابوالجیش خمارویہ احمد بن طولون امیر المومنین کے مولی نے مجھے اپنے اوپر گواہ مقرر کیا۔

لیکن جب امام طحاوی دستخط فرمانے لگے تو بجائے اس کے یہ لکھا کہ:

شهدت على إقرار الأمير أبي الجيش بن أحمد بن طولون مولى أمير المومنين أطال الله بقائه وأدام عزه وأعلاه.

امیر ابوالجیش بن احمد بن طولون مولی امیر المومنین (خدا ان کی عمر دراز کرے اور ان کی عزت کو ہمیشہ باقی رکھے انھیں سربلندی عطا رکے) کے متعلق میں نے یہ گواہی دی۔

دستخط کی اس عبارت پر جب خمارویہ کی نظر پڑی تو چونکا اور قاضی محمد بن عبدہ سے پوچھا ''من ہذا'' (یہ کون ہیں) قاضی نے کہا میرا اسکریٹری ہے۔خمارویہ نے پوچھا ان کی کنیت کیا ہے؟ قاضی نے کہا کہ ابوجعفر، یہ سن کر امام طحاوی کی طرف رخ کر کے خمارویہ نے کہا:

وأنت يا أباجعفر فأطال الله بقائك وأدام عزك وأعلاك. ①

آپ ہیں ابوجعفر! اللہ آپ کی عمر بھی دراز کرے اور آپ کی عزت کو برقرار رکھے اور آپ کو سربلندی عطا کرے۔

پھر کیا تھا قاضی شہر کی وہ عنایتیں اور والی ملک کی یہ مہربانیاں، اس کے بعد جو کچھ بھی امام طحاوی کے غنا و فراغبالی کے متعلق کہا جائے کہا جا سکتا ہے خصوصاً جب ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ایک مدت

① ملحقات للکندی، محمد بن عبدہ، ص: ۵۱۷۔

تک خمارویہ قاضی محمد بن عبدہ کا انتہائی عقیدت مند تھا۔انھوں نے ایک دفعہ ایک بڑی شدید فوجی شورش کو اپنی تدبیر اور بہادری سے دبا دیا تھا جس میں خمارویہ کو اپنی جان تک کا خطرہ تھا۔فوج خلاف ہوگئی لیکن کہا جاتا ہے کہ قاضی خود فوج میں پہنچ گئے۔ایک تو ان کے علم وفن کا لوگوں پر یوں ہی اثر کیا کم تھا لیکن تقریر کرتے ہوئے جوش میں قاضی کی زبان سے یہ الفاظ نکل پڑے کہ ''خود میں تلوار اور کمر بند باندھ لوں گا اور امیر کی طرف سے مقابلہ کروں گا''، تو فوج پر سناٹا چھا گیا اور پھر کسی میں مجال دم زدن نہ رہی۔امیر قاضی کا بہت ممنون ہوا۔

اس واقعہ کے بعد محمد بن عبدہ کا رسوخ حکومت میں اتنا بڑھ گیا کہ گویا وہی مصر کے والی تھے اور اس کی وجہ سے ان کے دنیاوی مشاغل بظاہر اتنے بڑھ گئے کہ قضاء کے معاملات میں مسئلہ مسائل اور قانونی دفعات کے متعلق بجائے خود غور وفکر، مطالعہ وتجسس کرنے کے لیے ان کو بالکل طحاوی کے سپرد کر دیا، لوگوں کا بیان ہے کہ مجلس قضاء میں جس وقت قاضی صاحب فیصلہ کے لیے بیٹھتے اور بازو میں امام طحاوی بحیثیت سکریٹری کے بیٹھتے، مقدمہ پیش ہوتا، قاضی صاحب تو خاموش رہتے اور ان کی طرف سے منسوب کرتے ہوئے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ یوں فیصلے صادر کرتے:

من مذهب القاضي أيده الله كذا ومن مذهب القاضي كذا.

یعنی اس مقدمہ میں قاضی صاحب (ایدہ اللہ) کا یہ خیال ہے۔قاضی صاحب کا وہ خیال ہے۔

حافظ ابن حجر وغیرہ کے حوالہ سے ملحقات کندی میں منقول ہے کہ امام طحاوی کا یہ طرز عمل اس لیے تھا کہ وہ قاضی کا بار اپنے اوپر لے لیں اور ان کو مسائل بتا دیں۔افیسر اور عہدہ داروں کو اپنے ماتحت پر جب اتنا اعتماد ہو جاتا ہے تو عموماً ایسے موقعہ پر اگر ماتحت سے کچھ ''خود بینی'' اور اپنی قابلیت پر کچھ ناز کے آثار کا ظہور ہو تو اس میں تعجب نہ ہونا چاہیے۔کہتے ہیں کہ ابو جعفر نے ''من مذهب القاضي ايده الله'' کا فقرہ اس کثرت سے دہرانا شروع کر دیا کہ قاضی محمد بن عبدہ کو ناگوار

ہوا۔

باوجود اس قدر ماننے اور چاہنے کے قاضی صاحب کی علمی فضیلت ورفعت پر اس سے چوٹ پڑی، خدا جانے واقعہ تھا بھی یا نہیں لیکن قاضی کو یہی محسوس ہوا۔ محسوس ہونا تھا کہ چہرہ بدل گیا اور طحاوی کو مخاطب کر کے کہنے لگے:

''ارے تم کس خیال میں ہو، خدا کی قسم اگر میں کسی بانس کو بھیجوں کہ تمہارے محلّہ میں گاڑ دیا جائے تو تم دیکھو گے لوگوں میں وہ ''قاضی کے بانس'' کے نام سے مشہور ہو جائے گا۔''

مطلب یہ تھا کہ تمہیں اپنے متعلق غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے، تم تو خیر آدمی ہو، عالم ہو، اگر میں تمہارے محلّہ میں بانس کو بھی جا کر گاڑ دوں، تو ساری دنیا اس وقت سے اس کو قاضی کا بانس کہنے لگے گی، اس کی شہرت وعظمت قائم ہو جائے گی۔ آپ کی سربلندی اور عزت ووجاہت میری وجہ سے ہے۔ اس علم وفضل کا نتیجہ نہیں جس پر کچھ آپ اترانے لگے ہیں، آخر اس علم وفضل کے ساتھ اس شہر میں تم پہلے بھی تو تھے، پھر دنیا کا تمہارے ساتھ کیا سلوک تھا۔ آخر میں بوڑھے قاضی نے امام طحاوی کو سمجھاتے ہوئے نرم لہجہ میں کہا:

فاحذر یا أباجعفر. ① ذرا بچتے رہنا میاں ابوجعفر۔

بیچارے نوکر تھے، چپ ہو گئے، ورنہ سچ یہ ہے کہ قاضی محمد بن عبدہ یوں اپنے جود وکرم میں کچھ ہی ہوں مگر علمی لحاظ سے ان کو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ سے کوئی نسبت نہ تھی اگرچہ وہ اپنے کو بڑے بڑے محدثین حتی کہ علی بن مدینی جیسے ائمہ حدیث کا شاگرد بتاتے تھے، لیکن اس زمانہ میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانباز خداموں کی جو مخلص جماعت اس قسم کے لوگوں کی ٹوہ میں لگی رہتی تھی اس نے اسی زمانہ میں ان کا سارا چٹھا کھول کر رکھ دیا تھا۔ رجال کی مشہور کتاب ''الکامل'' کے مصنف

① ملحقات للکندی، محمد بن عبدہ، ص: ۵۱۶۔

علامہ ابن عدی نے تو خود اپنا تجربہ ان کے متعلق بیان کیا ہے کہ اس شخص سے میں نے موصل اور بغداد میں حدیثیں سنی تھیں۔ اسی زمانہ میں دعویٰ کر دیا کہ بکر بن عیسیٰ محدث کے بھی وہ براہ راست شاگرد ہیں۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ میرے سامنے اس شخص نے یہ دعویٰ کیا حالانکہ میں جانتا تھا کہ بکر کی وفات اس شخص کی پیدائش سے تین سال پہلے ہو چکی تھی۔ ابن عدی ہی کا یہ بیان ہے کہ حدیث کی جو کتابیں اس شخص کی پاس تھیں میں نے ان کو بھی دیکھا تھا، جن کتابوں سے یہ شخص حدیثیں بیان کرتا تھا ان کی پشت چھلی ہوئی تھی یعنی کتاب کی پشت سے ان لوگوں کا نام چھیل دیتے تھے جن کی وہ اصل روایت ہوتی۔ پھر بڑی دلیل سرقہ کی ان کے یہ تھی کہ ایسی حدیثیں بھی روایت کرتے تھے جو صرف مشہور جلیل حفاظ کے ساتھ مخصوص تھیں یہ دلیل ہے کہ اس شخص نے ان لوگوں سے یہ حدیثیں چرائی تھیں①۔ بہر حال وہی بات کہ:

آنکہ شیراں را کند روبہ مزاج　　احتیاج است احتیاج است احتیاج

مصر کا انقلاب اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے مصائب:

محمد بن عبدہ قاضی کے زمانہ تک امام طحاوی کی بڑے آرام سے گذری۔ تقریباً یہ چھ سال کی مدت تھی کہ اچانک پھر ارض فرعون میں بھونچال آیا۔ خمارویہ احمد بن طولون کا بیٹا جو قاضی محمد بن عبدہ اور ان کے سکریٹری کا قدر شناس تھا، اپنے غلاموں کے ہاتھوں دمشق میں مارا گیا۔ دمشق سے لاش مصر آئی۔ قاضی محمد بن عبدہ کو بہت رنج پہنچا۔ خمارویہ کے جنازہ کی نماز قاضی ہی نے پڑھی، لوگوں نے خمارویہ کے بیٹے جیش نامی کو امیر منتخب کیا اور قاضی بھی قاضی محمد بن عبدہ ہی رہے لیکن یہ حالت کل نو مہینے دس دن تک باقی رہی، جیش کو بھی اس کے غلاموں نے قتل کیا اور اس کے بھائی ہارون بن خمارویہ کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت کی، قاضی محمد بن عبدہ بھی حال دیکھنے کے لیے

① ملحقات للکندی، محمد بن عبدہ، ص: ۵۱۵۔

باہر نکلے۔ ہارون کا نائب السلطنت ایک شخص محمد بن اَبّا تھا، اس نے جیش کے زمانہ کے لوگوں کو مجرم قرار دیا، قاضی محمد بن عبدہ تو گھر کا دروازہ بند کر کے گوشہ گیر ہو گئے، باہر نکلنا پھرنا بالکلیہ ترک کر دیا، بڑے آدمی تھے ان کی کنارہ کشی ہی غنیمت شمار کی گئی①۔ لیکن جن ماتحتوں پر مصیبت آئی انھیں میں ہمارے امام طحاوی بھی تھے مؤرخین لکھتے ہیں کہ محمد بن اَبّا نے قاضی محمد بن عبدہ کے ساتھیوں کے ساتھ

ضيق عليهم واعتقل الطحاوي وطالبه بحساب الأوقاف.②

ان کی زندگی تنگ کی، طحاوی کو اس نے قید کر لیا اور اوقاف کے حساب کا ان سے مطالبہ کیا۔

افسوس کہ امام طحاوی کی زندگی کا یہ ایسا اہم واقعہ ہے لیکن عام تاریخوں میں اس کا ذکر ہی نہیں، ضمنی طور پر یہ دو لفظ تلاش کے سلسلہ میں مجھے مل گئے۔ لیکن یہ سوال کہ علم کا یہ یوسف زندان مصر میں کتنے دن رہا اور اس پر کیا کیا گذری، اس کا کچھ پتہ نہیں، حتیٰ کہ یہ بھی معلوم نہیں کہ قید کی مدت کیا تھی۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اوقاف جن کے حساب و کتاب کی صفائی کا ان سے مطالبہ کیا گیا تھا ان کی صفائی پیش کر دی گئی اور ان کو جیل سے نجات ملی کیونکہ ہارون ابن خمارویہ کی پوری مدت حکومت جو تقریباً آٹھ سال کے قریب ہے اگر وہ جیل میں رہ جاتے تو یقیناً اس کا ذکر ذرا تفصیل سے مؤرخین کرتے۔ معلوم یہی ہوا ہے کہ اعتقال کی مدت تھوڑی تھی اس لیے عام طور پر اس کو اہمیت نہ دی گئی۔

جیسا کہ میں نے کہا کہ ہارون بن خمارویہ جس کے دور حکومت میں طحاوی اور ان کے قاضی کی برطرفی عمل میں آئی، اس شخص کی حکومت آٹھ سال کے قریب رہی، حکومت

---

① رفع الاصر کے حوالہ سے ملحقات الکندی میں یہ عبارت درج ہے، "واستتر ابو عبيد الله (محمد بن عبده) عشر سنين رضى عنه الامير و غيره بذلك فلم يطالبوه و لا سالوا عنه"۔

② ملحقات الکندی، محمد بن عبدہ، ص: ۵۱۷۔

کے اس دور میں قاضی محمد بن عبدہ کے متوسلین کا زندہ سلامت رہ جانا ہی غنیمت تھا چہ جائیکہ ان کو حکومت سے پھر کسی قسم کی نوکری ملتی اور شاید امام ابوجعفر طحاوی پر کوئی سخت زمانہ پھر آجاتا لیکن ایک تو محمد بن عبدہ کی کتابت بلکہ نیابت کے زمانہ میں طحای نے بہت کچھ کما لیا تھا۔ ممکن ہے کہ اس عرصہ میں انھوں نے کچھ جائیداد بھی حاصل کر لی ہو، جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا۔ نیز ایک بڑا احسان امام طحاوی پر قاضی محمد بن عبدہ نے اپنے قضاء ہی کے زمانہ میں یہ کر دیا تھا کہ امام طحاوی کی موروثی جائیداد جس پر ان کے چچا قابض تھے، امام طحاوی کی خواہش کے مطابق اس کا امام اور ان کے چچا کے درمیان تقسیم کرا دیا تھا، فیصلہ لکھ کر قاضی صاحب نے امام طحاوی کے حوالہ کیا اور کہا:

تستعين به على ذلك.① اس فیصلہ سے تم بٹوارے میں مدد حاصل کرو۔

خدا کی مہربانی تھی کہ اس طرح قبل ان سیاسی اختلالات کے جو آنے والے تھے ان کو ایک جائیداد ہاتھ لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن ابا، ہارون بن خمارویہ کے نائب کے ہاتھ سے ان کو نجات ملی، تو جو کچھ ایام ملازمت کا کمایا باقی رہ گیا اس سے اور اسی جائیداد سے ان کی اوقات بسری ہوتی رہی۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اس حادثہ کے بعد اس عجوزہ ہزار دامادیعنی حکومت سے انھوں نے پھر ملازمت کے تعلقات کبھی نہیں پیدا کئے حالانکہ اس کے مواقع ان کو ملتے رہے، سب سے پہلا موقعہ تو یہی ملا کہ ہارون بن خمارویہ جب مارا گیا اور بغداد سے خلیفہ المکتفی باللہ کی طرف سے محمد بن سلیمان کاتب اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا اور وہ مصر پر قابض ہو گیا، تو اس نے پھر ہمارے امام طحاوی کے قاضی یعنی محمد بن عبدہ کا ولایت قضاء پر تقرر کیا مگر اس وقت اس کے ساتھ امام طحاوی نظر نہیں آتے۔

خیر محمد بن سلیمان نے اسی سلسلہ میں چلتے ہوئے یہاں کا قاضی علی بن الحسین بن حرب کو مقرر کیا۔

---

① ملحقات للکندی، محمد بن عبدہ، ص: ۵۱۷۔

عام طور رلوگ ان کو قاضی حربویہ کہتے تھے ان کا بھی شمار عجائب القضاۃ میں تھا۔ مصر کے مشہور محدث مؤرخ ابن یونس نے سچ لکھا ہے:

كان شيأ عجيبا ما رئينا قبله ولا بعده مثله. ①

عجیب شخصیت تھی ایسا آدمی نہ ہم نے اس سے پہلے دیکھا اور نہ اس کے بعد۔

علم وفضل میں جتنے غیر معمولی تھے اس سے زیادہ عادات واطوار میں غرائب تھے۔ مصر میں رہے، نیل کے پل پر سے گذرے لیکن صرف پانی آواز سنی پانی نہیں دیکھا، کھاتے، ہاتھ دھوتے وضو کرتے ان کو کسی نے نہیں دیکھا۔

حالانکہ شافعی المذہب تھے، امام شافعی کے بغدادی شاگرد ابوثور کی فقہ کے ابتداء میں پابند تھے اور اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے لیکن بعد کو خود اجتہاد کرنے لگے۔ یہی قاضی علی بن الحسین ہیں جس سے اور امام طحاوی سے تقلید کے متعلق ''لا يتقلد إلا عصبي او غبي'' کا فقرہ مشہور ہوا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام طحاوی اور قاضی علی بن الحسین میں اچھے مراسم تھے۔ لیکن باوجود اس کے اام طحاوی نے ان کے زمانہ میں کوئی نوکری نہیں کی۔ ہاں ابن خلکان نے ایک واقعہ کا ذکر طحاوی کے ترجمہ میں کیا ہے لیکن وہ ملازمت نہیں بلکہ اور چیز ہے۔ ابن خلکان نے تو مختصر لکھا ہے، میرے نزدیک تفصیل اس کی یہ ہے کہ معاشی فراغ بالی کا جب قاضی محمد بن عبدہ کے زمانہ میں خدا نے طحاوی کے لیے نظم کر دیا اور حکومتی کاروبار سے یہ الگ تھلگ رہنے لگے تو بالکلیہ تصنیف وتالیف درس وتدریس میں مستغرق ہوگئے اب تک مصر پر ان کی علمی جلالت قدر جیسی کہ چاہئے تھی کھلی نہ تھی اور حکومت کے تعلقات نے اس پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ اب جب ان کو آزادی میسر آئی تو بہت جلد ملک کے ہر طبقہ میں ان کی علمی عظمت قائم ہوگئی، ظاہر ہے کہ ایسی شخصیتوں کا محسود

① ملحقات للکندی، علی بن الحسین بن حرب، ص: ۵۲۴۔

ہو جانا ایک قدرتی بات ہے۔ اس وقت تو یہ آزاد تھے لیکن اسی زمانہ میں جب قاضی محمد بن عبدہ کے عہد میں حکومت کی ملازمت کا داغ علم وفضل کے دامن پر لگا ہوا تھا اور ان کی ہر خوبی ''سرکاری ملازم'' کے لفظ کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ ایک حاسد قاضی محمد بن عبدہ کے اجلاس میں اپنے اس کمینہ جذبہ کو دبا نہ سکا۔ ذہبی نے لکھا ہے کہ طحاوی محمد بن عبدہ کے اجلاس میں بیٹھے تھے کہ رجل معتبر قاضی کے اجلاس میں آئے اور معلوم نہیں کس غرض سے یہ سوال کیا:

أيش روى أبوعبيده بن عبدالله عن أمه عن أبيه.

ابوعبیدہ بن عبداللہ نے اپنی ماں سے اپنے باپ سے کیا روایت کیا ہے۔

یہ فن حدیث کا ایک علمی سوال تھا۔ طحاوی یوں ہی قضائی سوالات کے جوابات قاضی کی طرف سے دیا کرتے تھے یہ تو علمی سوال تھا برجستہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کہنے لگے:

حدثنا بكار بن قتيبة انا احمدنا سفيان عن عبدالأعلى الثعلبي عن أبي عبيدة عن أمه عن أبيه أن رسول الله صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قال: إن الله ليغار للمومن فليغر وحدثنا به إبراهيم بن داؤد قالنا سفيان بن وكيع عن أبيه عن سفيان موقوفا.

ہم سے بکار بن قتیبہ نے حدیث بیان کی وہ کہتے ہیں کہ ہم سے احمد نے بواسطہ سفیان بیان کیا۔ سفیان عبدالاعلی ثعلبی سے راوی ہیں وہ اپنی ماں سے اور ان کی ماں ان کے والد سے راوی ہیں کہ رسول اللہ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ مومنوں کے لیے غیرت کا خواہاں ہے پس مومن کو غیرت کرنی چاہیے۔

رجل معتبر امام طحاوی کی اس حاضر جوابی پر دنگ ہو گیا اور گھبرا کر کہنے لگا:

تدري ما تقول،تدري ماتتكلم به.

جانتے ہو یہ کیا کہہ رہے ہو، سمجھ رہے ہو کیا بول رہے ہو۔

امام طحاوی کو اس سوال پر ذرا غصہ آ گیا اور فرمانے لگے کہ ''ما الخبر'' (آخر کیا کہنا چاہتے ہو) رجل

معتبر سے دبایا نہ جاسکا اور اپنے جذبہ کا اظہار ان لفظوں میں کرنے لگا:

''میں نے کل شام کو تمہیں فقہاء کے میدان میں دیکھا اور آج تم حدیث والوں کے میدان میں ہو حالانکہ دونوں باتیں (فقہ وحدیث) ایک شخص میں کم جمع ہوتی ہیں۔''

مطلب یہ تھا کہ میاں تم تو فقہ کے میدان کے آدمی ہو یہ دھڑا دھڑ حدثنا اور اخبرنا جو تم نے شروع کر دیا سمجھ کے بھی کہہ رہے ہو یا بے پر کی اڑا رہے ہو۔ عموماً فقہ وحدیث دونوں علوم کے کمالات ایک آدمی میں جمع نہیں ہوتے امام طحاوی جواب میں یہ فقرہ فرما کر خاموش ہو گئے۔

هذا من فضل الله وإنعامه.① یہ اللہ کا فضل اور اس کا انعام ہے۔

قاضی حربویہ اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ:

خلاصہ یہ ہے کہ ملازمت کا داغ جس زمانہ میں لوگوں کی تسلی کرتا تھا اس وقت تو یاروں کا یہ حال تھا جب سے الگ ہو کر علم ہی پر ٹوٹ پڑے اور اس کے نتائج وثمرات ظاہر ہونے لگے تو اس نے دلوں کے حاسدانہ جذبات میں اور تیزی پیدا کر دی، اور تو لوگ ان کا کیا بگاڑ سکتے تھے، ایک موقعہ حریفوں کا مل گیا، قاضی العمری جو جیل کی دیوار پھاند کر بھاگے تھے اور ان کا کچھ ذکر پہلے آچکا ہے انہی نے ایک نئے دستور کی بنیاد مصر میں ڈال دی تھی، یعنی شہر کے ممتاز اور برگزیدہ لوگوں کی ایک فہرست تیار کرائی تھی، غالباً ہر ہر محلّہ سے ایسے لوگوں کا انتخاب ہوا تھا، مقصد اس کا یہ تھا کہ مختلف مقدمات میں ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ مدعی مدعی علیہ اور مقدمہ کے گواہوں کے حالات کسی معتبر آدمی سے دریافت کئے جائیں، نیز اور بھی دوسری ضرورتوں میں شناخت کنندگان کی حاجت پڑتی تھی، یا کسی معاملہ کی تحقیق کے لیے جہاں خود قاضی نہ جا سکے وہاں ان معتبر آدمیوں کو بھیج دیا جاتا تھا تاکہ واقعہ کی صحیح دریافت کر کے محکمہ میں رپورٹ کریں اور ان

① تذکرۃ الحفاظ للذہبی، رقم الترجمۃ ۷۹۷، الطحاوی، ج:۳، ص:۸۰۹۔

لوگوں کا نام ''الشہود'' رکھا گیا۔ العمری کے ترجمہ میں السیوطی نے لکھا ہے:

هو اول من دون الشهود① — پہلا آدمی ہے جس نے ''الشہود'' کا رجسٹر تیار کیا۔

ابتداء میں تو شاید چنداں اہمیت کی چیز نہ سمجھی گئی لیکن جب ان لوگوں کے بیانات پر ہزاروں اور لاکھوں مقدمات کا فیصلہ ہونے لگا اور ہر بات میں الشہود سے مشورہ محکمہ عدالت لینے لگا تو پھر بتدریج ان کی اہمیت ملک میں بڑھنے لگی، تا اینکہ ایک وقت وہ بھی آ گیا کہ جس کا نام دیوان الشہود میں نہ ہوتا وہ لوگوں کی نگاہوں میں بے وقعت ہو جاتا تھا۔ گویا اس کے معنی یہ ہوتے تھے کہ اپنے محلّہ میں بھی اس کو علمی اور دینی امتیاز حاصل نہیں ہے گویا وہ بیچارہ تھرڈ کلاس کا آدمی شمار ہوتا تھا۔

امام طحاوی کا جب علمی دور دورہ شروع ہوا تو جیسا کہ میں نے عرض کیا اب وہ حکومت کے ملازم تو تھے نہیں جو کسی سازش کا شکار ہوتے۔ پس اتنا موقع لوگوں کے لیے رہ گیا کہ کسی طرح سے ''دیوان الشہود'' سے ان کا نام نکلوا دیا جائے اور اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ کسی مقدمہ میں اظہار کا موقع جب آئے تو سارے الشہود یا ان کی اکثریت اس پر اتفاق کر لیتی کہ یہ شخص گواہی کے لائق نہیں ہے، امام بیچارے کے ساتھ بھی یہی ترکیب کی گئی، ابن خلکان نے لکھا ہے کہ،

كان الشهود يتعسفون عليه. — الشہود نے طحاوی پر زیادتی شروع کی۔

اور اس تعسف اور ہٹ دھرمی اور زیادتی کی وجہ خود قاضی ابن خلکان باوجود یکہ طحاوی سے کدورت بھی رکھتے تھے خود ہی یہ فرماتے ہیں کہ:

لئلا تجتمع له رياسة العلم وقبول الشهادة. ② — یہ اس لیے کرتے تھے تا کہ علم اور شہادت کی مقبولیت دونوں شرف ان کو نہ حاصل ہوں۔

---

① حسن المحاضرۃ للسیوطی، باب ذکر قضاۃ مصر، ج:۲، ص:۱۳۸۔

② وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ:۲۵، الطحاوی، ج:۱، ص:۴۴۔

مطلب یہ تھا کہ جنھیں علم وفضل کی راہ سے اونچا ہونے کا موقعہ نہیں ملتا تھا تو تسبیح ومصلی، درازی ریش وغیرہ کی آڑ میں نہیں تو کچھ الشہود ہی کی فہرست میں نام درج کرا لیتے تھے اور اسی کو اپنے لیے بڑا کمال سمجھتے تھے، امام طحاوی میں دونوں باتیں جمع ہوگئی تھیں، تقویٰ بھی اور علم بھی، یہی چیز ان لوگوں کو ناگوار گزرتی تھی چاہا کہ ایک رخ تو اس کا بگاڑ دو، حکومت اور عام پبلک میں تو بے وقعت ہوجائے گا، رہا علم تو اپنی کوٹھڑی میں ملا اپنے ہاتھ میں قلم لیے گھسیٹتا رہے یا معلم الصبیانی میں دماغ چٹواتا رہے مگر ہمارے میدانوں میں تو نہ آئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حریفوں کی یہ چال کامیاب ہوگئی اور امام طحاوی جیسے امام کا ان عامیوں نے الشہود کی فہرست سے نام نکلوا دیا، بعض مقدمات میں اکثریت نے ان کی عدالت اور تقویٰ کی ناقابل اطمینان قرار دیا۔ یہ حادثہ امام طحاوی کے ساتھ اس وقت پیش آیا جب قاضی الحسین بن علی بن حرب کا زمانہ تھا۔

ابن خلکان کا بیان ہے کہ اس عرصہ میں منصور فقیہ جو قاضی حربویہ کے بڑے مداحوں میں تھے ان میں اور حربویہ میں ایک قصہ پیش آیا، جس میں امام طحاوی کی طرف سے قاضی حربویہ کو کوئی مدد ملی اور ان کی ہمدردی طحاوی سے بڑھ گئی۔ آخر مام طحاوی سے قاضی حربویہ کے دل میں حنفی ہونے بلکہ شافعی مذہب ترک کر کے حنفی مسلک اختیار کر لینے کی وجہ سے لاکھ خلش اور کدورت ہو لیکن ان کے علم وفضل تقویٰ ودیانت کا محض ان فروعی اختلافوں کی وجہ سے جہاں تک میرا خیال ہے انکار نہیں کر سکتے تھے۔

خیر میرا خیال ہے کہ الشہود کی اکثریت ہی سے وہ مجبور تھے اس لیے مصر میں جب ایک قصہ پیش آیا تو انھوں نے اس سے نفع اٹھایا قصہ یہ ہے کہ مصر کے جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں یہاں کے حکومتی امراء میں ایک مشہور آدمی محمد بن علی المازرائی بھی تھا۔ اس امیر پر کسی معمولی عورت نے

شفعہ کا دعویٰ قاضی حربویہ کے اجلاس میں دائر کر دیا۔ قاضی صاحب جیسے سخت آدمی تھے امیر ہو یا غریب دونوں ان کی نگاہوں میں برابر تھے، انھوں نے الماذرائی کے نام فوراً حاضر ہونے کا سمن جاری کر دیا لیکن امراء دوسرے قاضیوں کے بگاڑے ہوئے تھے، اس نے قاضی کے حکم کا مقابلہ کیا اور حاضر نہ ہوا مگر قاضی کی سخت مزاجی سے واقف تھا، ترکیب یہ کی کہ فوراً حج کو اعلان کر کے حجاز روانہ ہو گیا، مصر میں الشہود کا جو طبقہ رہتا تھا الماذرائی کا سفر حج ان لوگوں کے لیے غنیمت تھا، ان کی بڑی تعداد اس کے حشم اور بارگاہ کے ساتھ حجاز روانہ ہو گئی۔ الماذرائی نے تو خیال کیا کہ معمولی عورت کا قصہ ہے، اس عرصہ میں رفع دفع ہو گیا ہوگا، حج سے فارغ ہونے کے بعد مصر واپس آیا لیکن ارباب تسبیح و مصلی کو اپنے دینی وقار میں وزن پیدا کرنے کا یہ اچھا موقعہ تھا، شہود کی جماعت مزید ایک سال کے لیے مکہ معظّمہ میں ہی مقیم رہی۔ اس طرح گویا مصر شہود کی بڑی تعداد سے اس زمانہ میں خالی ہو گیا تھا۔ اب قاضی صاحب نے بغیر کسی جدید تاثر کے یا جیسا کہ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ایک واقعہ سے متاثر ہو کر اس موقعہ سے امام طحاوی کی صفائی کے لیے فائدہ اٹھانا چاہا۔ انھوں نے اس سلسلہ میں کیا صورت اختیار کی اس کا ذکر تو بعد کو آئے گا۔

میں چاہتا ہوں قاضی حربویہ اور منصور فقیہ کے جس قصہ کی طرف ابن خلکان نے اشارہ کیا ہے پہلے اس کی تفصیل پیش کروں پھر بتاؤں گا کہ اس واقعہ میں طحاوی پر چھپے چھپے طریقہ سے شافعیوں کے دائرہ میں جو سرگوشیاں ہوتی رہی ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔ آخر میں یہ بھی بتاؤں گا کہ بالفرض قاضی حربویہ کے دل میں امام طحاوی کی ہمدردی کسی جدید واقعہ کا بھی نتیجہ اگر قرار دیا جائے تو بجائے قصہ منصور فقیہ کے قاضی حربویہ اور طحاوی کے درمیان جو ایک اور واقعہ پیش آیا ہے اگر اس کو اس جدید ہمدردی کی گونہ علت ٹھیرائی جائے تو زیادہ مناسب ہے۔

قاضی حربویہ اور منصور فقیہ کی شکر رنجی کا واقعہ:

بہر حال منصور فقیہ اور حربویہ کے درمیان والے قصہ کا ذکر ابن خلکان نے اپنی کتاب میں دوسری جگہ کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قاضی حربویہ کے منجملہ اور عجیب معمولات کے ایک دوامی معمول یہ بھی تھا کہ جمعہ کے سوا ہفتہ کی کل راتوں کو انھوں نے مصر کے مختلف علماء وفضلا کی صحبت اور علمی بحث وتمحیص کے لیے مختص کر رکھا تھا جس کی ایک باضابطہ فہرست بنی ہوئی تھی، ایک رات امام شافعی کے شاگرد ربیع جیزی کے لیے دوسری عفان بن سلیمان، تیسری السجستانی، چوتھی منصور فقیہ، پانچویں امام ابوجعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے لیے، اور یوں ہی ایک رات کسی اور عالم کے لیے۔ جمعہ کی رات صرف اس سے مستثنیٰ تھی۔

اتفاق سے منصور فقیہ والی رات میں جہاں اور مسائل کا ذکر ہو رہا تھا اس مسئلہ کا ذکر بھی آیا کہ حاملہ عورت کو اگر طلاق دی جائے تو عدت کے ایام میں طلاق دینے والے شوہر پر ان کا نان ونفقہ واجب ہے یا نہیں؟ قاضی حربویہ نے اسی سلسلہ میں یہ بھی کہا کہ:

زعم قوم أن لا نفقة لها في الثلاث وأن نفقتها الطلاق غير الثلاث.	بعضوں کا خیال ہے کہ تین طلاق کی صورت میں نفقہ کا استحقاق نہ ہوگا اور تین سے کم طلاق میں ہوگا۔

نان ونفقہ مطلقہ کی بحث:

یہ دراصل امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور اختلافی نقطہ نظر پر تعریض تھی، ان کا مسلک تھا کہ نفقہ صرف اس عورت کو ملے گا جسے رجعی طلاق دی گئی ہو، باقی تین طلاقیں جس سے عورت پھر رجعت کے قابل بجز حلالہ اور جدید نکاح کے نہیں رہتی، چونکہ اس کا تعلق شوہر سے بالکلیہ منقطع ہو جاتا ہے اس لیے اب کس بات کا نفقہ؟ لیکن اس مسئلہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے صحابہ خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مطابق فیصلہ اِس لیے نہیں کیا تھا کہ وہ ایک مشہور صحیح حدیث فاطمہ بن قیس کے خلاف تھا۔ یہ

عورت ابوعمر بن حفص کی بیوی تھی لیکن زبان بہت تیز تھی، ان کے شوہر نے تنگ آ کر ان کو طلاق بائن دے دی تھی۔ ان کا قصہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا، تو فاطمہ بن قیس کا بیان ہے کہ آپ نے فرمایا: ''لیس لک نفقۃ'' اب تیرا نفقہ تیرے شوہر پر واجب نہ رہا، عدت گذرنے کے بعد چند آدمیوں نے نسبت بھیجی جن میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ آنحضرت ﷺ سے فاطمہ نے اس باب میں مشورہ کیا تو آپ نے فرمایا: معاویہ فقیر ہیں ان کے پاس مال کہاں ہے اور حکم دیا کہ اسامہ بن زید سے نکاح کرلو۔ خیر یہ قصہ تو طویل ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اس مسئلہ نے بڑی اہمیت حاصل کر لی۔ ایک طرف قرآن کی آیت مطلقہ عورتوں کے متعلق اطلاقی شکل میں موجود تھی:

لا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ (الطلاق:1)

نہ نکالو ان کو ان کے گھروں سے اور نہ نکلیں وہ لیکن یہ کہ کوئی کھلی ہوئی فحش بات ان سے صادر ہو۔

نیز ہر قسم کی عورتوں یعنی آئسات، نابالغات، حاملات سب کی عدت کا ذکر فرمانے کے بعد قرآن کا حکم ہے کہ:

أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ وَلا تُضَآرُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ (الطلاق:6)

جہاں تم رہتے ہو وہیں ان کو رکھو اور ان کو ضرر نہ پہنچاؤ تاکہ ان پر زندگی کو تنگ کرو۔

اس سے عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ مطلقہ خواہ بطلاق رجعی ہو یا مغلظہ و بائن سب ہی کے لیے یہ قانون عام ہے اور اس پر عمل درآمد بھی تھا کہ اتنے میں فاطمہ بن قیس نے اپنا قصہ بیان کر کے اور آنحضرت کی طرف ''لیس لک نفقۃ'' کے فتوے کو منسوب کر کے ایک ہنگامہ برپا کر دیا، فاطمہ کو اس فتویٰ اور اپنی یاد اور سمجھ پر اصرار تھا لیکن صحابہ قرآن سے مجبور تھے، بخاری میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فاطمہ کو بلا کر فرمایا ''الا تتقي الله''۔ بالآخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعلان فرما دیا کہ:

لا نترك كتاب ربنا و لا سنة نبينا لقول امراة

ہم اپنے رب کی کتاب اور اپنے نبی کی سنت ایک

لاندري احفظت أم نسيت لها السكنى والنفقة.

عورت کی بات کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے۔نہیں معلوم اس کو یاد رہا یا بھول گئی، پس مطلقہ کے لیے سکنی اور نفقہ دونوں دلایا جائے گا۔

اور اس پر صحابہ کا تقریباً اجماع قائم ہو گیا لیکن فاطمہ کی روایت کی بنیاد پر کبھی کبھی یہ قصہ اٹھ کھڑا ہوتا تھا، جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ محدثین اور حدیث کی قیادت کا جھنڈا لے کر اٹھے تو اس فتنہ نے پھر سر اٹھایا۔ امام شافعی کو اصرار تھا کہ حدیث صحیح سے جب ثابت ہے کہ مطلقہ ثلاثہ کے لیے نفقہ نہیں ہے تو اس کو ہم کیسے چھوڑ سکتے ہیں، قرآن کی آیتوں کے اطلاق کے دائرہ کو اسی فاطمہ کی روایت سے وہ محض رجعی طلاق والی عورتوں تک محدود کرتے تھے، اور بعض قرآنی آیات سے اپنی تائید بھی پیش کرتے تھے جس کا اپنے محل میں ذکر موجود ہے۔

اس مسئلہ نے درمیان میں کیسی کیسی صورتیں اختیار کی ہیں اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ حدیث کے مشہور امام شعبی کوفہ کی مسجد میں اسی فاطمہ کی روایت کو بیان کر رہے تھے عبداللہ بن مسعود کے خلیفہ اور شاگرد اسود بھی موجود تھے، شعبی کے رجحان کو فاطمہ کی روایت کی طرف پا کر بیان کیا جاتا ہے کہ اسود بے اختیار ہو گئے اور انھوں نے مٹھی بھر کر کنکریاں لیں اور شعبی کو پھینک ماریں۔

بعضوں کا یہ بھی خیال تھا کہ قرآن کی آیت: ﴿الا ان یاتین بفاحشة مبینة﴾ سے عملی بدکاری ہی مقصود نہیں ہے بلکہ اگر کسی کی زبان میں فحش گوئی کی عادت ہو تو وہ بھی اس میں داخل ہوسکتی ہے اور فاطمہ بنت قیس چونکہ زبان کی سخت تھیں اور یہ قاعدہ ہے کہ ایسی عورتیں بے ہوشی میں سب کچھ کہنے لگتی ہیں اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی طور پر زجراً ان کو ''لا نفقة لک'' کا حکم دیا تھا۔ سعید بن المسیب مشہور تابعی نے ایک موقعہ پر یہی فرمایا:

تلك امرأة فتنت الناس كانت لسنة. اس عورت نے لوگوں کو فتنہ میں ڈالا زبان کی سخت تھیں۔

خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بھی یہی خیال تھا انھوں نے فاطمہ کو ایک دن خطاب کر کے فرمایا:

''تم کو تمہاری زبان نے (شوہر) کے گھر سے نکالا اپنے دیوروں کے ساتھ زبان درازی کرتی تھیں اور اس کی وجہ سے بڑی گڑبڑ ان لوگوں میں پیدا ہوگئی تھی۔''

ظاہر ہے کہ اس بنیاد پر قرآن کی آیت اور روایت میں تطبیق پیدا ہو جاتی ہے یعنی فاحشہ کی صورت میں طلاق دینے والے شوہر کو حق ہے کہ نفقہ سے اس کو محروم کر دے۔

خلاصہ یہ ہے کہ باوجود ان تمام باتوں کے (معتبر سند) سے حدیث بیان کی جاتی ہے۔ اس پر حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو اتنا اصرار ہوا کہ انھوں نے فاطمہ ہی کے بیان پر بھروسہ کر کے یہی مذہب اختیار کیا، قاضی حربویہ جیسا کہ گذر چکا تلمذاً بھی شافعی المکتب تھے، نیز مدت سے وہ مسلکاً وافتاءً بھی شافعی اسکول کی شاخ ابوثور کی پیروی کرتے تھے لیکن مصر پہنچ کر ان کے خیالات میں تبدیلی ہوگئی تھی، غالباً یہ قاضی بکار کے پیدا کیے ہوئے ماحول اور ان کے بنائے ہوئے عالم امام طحاوی کی صحبتوں کا نتیجہ تھا، قاضی حربویہ نے جب اس مذکورہ بالا فقرہ کا اضافہ کیا تو گو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مسلک نہ تھا کیونکہ تین طلاق والی حاملہ عورت کے باب میں وہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ اس کو نفقہ دلایا جائے اور اس لیے یہ امام شافعی پر طعن بھی نہ تھا لیکن منصور فقیہ جو ایک نابینا سخت کٹر شافعی عالم تھے انھوں نے خدا جانے کیا سمجھا اور حربویہ کے جواب میں کہا:

هذا ليس من أهل القبلة. جو اس بات کا قائل ہے وہ اہل قبلہ میں نہیں ہے۔

یعنی جو تین طلاق والی حاملہ کو نفقہ نہیں دلاتا وہ تو اہل قبلہ سے نہیں ہے یعنی وہ مسلمان نہیں ہے۔ منصور اور حربویہ میں یہ گفتگو اس نقطہ پر ختم ہوگئی، منصور گھر چلے گئے، دوسرے دن امام طحاوی سے کہیں ملاقات ہوئی اور قاضی حربویہ اور اپنی گفتگو کا ان سے تذکرہ کیا، امام ابوجعفر اپنی باری والی

رات میں قاضی کے پاس آئے تو انھوں نے دریافت کیا کہ آپ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ علماء میں بعض لوگ اس کے قائل ہیں کہ تین طلاق والی عورت اگر حاملہ بھی ہو جب بھی اس کو نفقہ نہ ملے گا۔

چونکہ یہ واقعہ میں کسی کا مذہب نہ تھا قاضی صاحب نے کہا کہ یہ بات کس نے میری طرف منسوب کی ہے امام طحاوی نے منصور فقیہ کا جن سے سنا تھا نام لے دیا، اب خدا ہی جانتا ہے کہ منصور کو غلط فہمی ہوئی تھی یا کیا ہوا تھا قاضی حربویہ نے شدت سے انکار کیا جو کسی کا مذہب ہی نہیں ہے خواہ مخواہ کیوں کہوں گا کہ کسی کا مذہب ہے اور فرمایا کہ میں منصور سے اس کے منہ پر پوچھ کر اس کو جھٹلاؤں گا۔

دوسرے دن قاضی حربویہ نے شہر کے اہل علم کو جمع کیا، جب سارا مجمع اکٹھا ہو گیا تب انتظار ہونے لگا کہ آخر قاضی نے لوگوں کو کیوں کر جمع کیا ہے، قبل اس کے کہ کوئی کچھ پوچھے قاضی حربویہ نے خود پیش قدمی کی اور بغیر کسی تمہید وغیرہ کے غصہ میں منصور فقیہ کے نام اور ان کی نابینائی کی طرف تعریض کرتے ہوئے بولنے لگے:

قوم عميت قلوبهم كما عميت أبصارهم يحكون عنا مالم نقله.

بعض لوگ جن کے دل اندھے ہیں جس طرح ان کی بینائی غائب ہے مجھ سے ایسی باتیں نقل کرتے ہیں جو میں نے نہیں کہی ہیں۔

منصور کو پہلے اس اس واقعہ کی خبر نہ تھی کہ طحاوی اور قاضی میں میرے متعلق یہ باتیں ہوئی ہے اپنے نام اور اپنی صفت کی طرف اشارہ پاتے ہوئے سمجھ گئے کہ وہی رات والی بات ہے وہ بھی غصہ میں بھر گئے اور صرف اتنا کہہ کر کہ:

قد علم الله الكاذب.

جھوٹے کو خدا جانتا ہے۔

''نہض''، یعنی فوراً مجلس سے اٹھ گئے، مجمع پر سناٹا طاری تھا ہر شخص اپنی جگہ بیٹھا خاموش تھا، قاضی حربویہ کے جبروت وجلال کا لوگوں پر اتنا اثر تھا کہ بیچارے نابینا آدمی کو دروازہ تک پہنچانے کے لیے بھی کوئی نہ اٹھا۔ البتہ ابوبکر بن الحداد جو مصر میں اپنے وقت کے بڑے زبردست شافعی عالم گذرے ہیں اور کچھ دن کے لیے مصر کے قاضی بھی رہے ہیں ان نے نہ رہا گیا۔ انھوں نے منصور کا ہاتھ پکڑ لیا اور ان کے ساتھ باہر نکلے تا آنکہ ان کو سوار کرا دیا۔①

عجیب بات ہے کہ ان ہی ابوبکر بن الحداد کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں قاضی حربویہ شروع شروع مصر میں آئے تھے اور میں اس وقت جوان تھا، بشر بن نصر الفقیہ کے حلقہ میں میں بیٹھا تھا کہ یہی نابینا شافعی عالم منصور فقیہ بھی قاضی حربویہ سے مل کر اس مجمع میں پہنچے، میں نے اس نے پوچھا کہ کہیے نئے قاضی صاحب آپ نے کیسا پایا؟ اس وقت ان ہی نے قاضی حربویہ کے متعلق کہا تھا:

يا أبابكر رأيت رجلا عالما بالقرآن والحديث والفقه والاختلاف ووجوه المناظرة عالما باللغة والعربية عاقلا ورعا متمكنا.	ابوبکر میں نے اس شخص کو پایا کہ قرآن وحدیث فقہ اور اختلافی مسائل نظر وفکر کے مختلف پہلوؤں کا عالم ہے نیز لغت اور عربیت کا علم بھی رکھتا ہے، دانش مند متقی پرہیز گار صاحب وقار آدمی ہے۔

مدح کے ان غیر معمولی الفاظ کو سن کر ابن حداد نے کہا پھر تو یہ قاضی یحییٰ بن اکثم ہیں۔ یحییٰ بن اکثم کی ہستی اسلامی تاریخ قضاۃ میں خاص اہمیت رکھتی ہے اسی کی طرف اشارہ تھا۔ منصور فقیہ نے جواب میں کہا:

قلت الذي عندي فيه.	بھائی میرے خیال میں وہ جیسے ہیں اس کا میں نے اظہار کیا۔

مگر ایک معمولی بات کے سلسلہ میں دونوں (یعنی حربویہ اور منصور فقیہ) میں ایسی کشیدگی پیدا ہوئی

① وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۷۴۱، منصور الفقیہ، ج: ۳، ص: ۱۴۷۔

کہ پھر بجائے گھٹنے کے قصہ بڑھتا ہی چلا گیا، یہاں تک کہ اشخاص سے بڑھ کر اس کشمکش نے جماعتوں کو تیار کرنا شروع کیا۔ منصور فقیہ کا مصری فوج اور فوجی افسروں پر خاصا اثر تھا، ابن خلکان کا بیان ہے کہ منصور فقیہ کی طرفداری میں امیر ذکا اور فوج کا ایک طبقہ اور ان کے سوا بھی ایک گروہ منصور کا طرفدار بن گیا۔

اسی طرح شہر کے ارباب وجوہ ومناصب میں جو لوگ حربویہ کے عقیدت مندوں میں تھے انھوں نے قاضی کا پارٹ لینا شروع کیا اور چند دنوں تک اس فتنہ نے بعض مواقع پر نہایت نازک صورت اختیار کر لی۔ الغرض یہ سارا جھگڑا جیسا کہ ابن خلکان کا بیان ہے سب امام طحاوی کی وجہ سے کھڑا ہوا۔ اگر منصور فقیہ کی بات کا ذکر حربویہ سے نہ کرے تو دو دوستوں کی کشیدگی اس حد کو نہ پہنچتی، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا کیا قصور ہے؟ کوئی دنیا کی بات ہوتی تو کہا جاتا کہ امام نے گویا نمائی (لگانے بجھانے) کا کام کیا۔ ایک علمی مسئلہ تھا، منصور نے اس کو قاضی حربویہ کی طرف منسوب کیا کہ وہ ایسا کہتے تھے، امام طحاوی نے قاضی حربویہ سے براہ راست اس عجیب مذہب یعنی حاملہ مطلقہ ثلاثہ کو بھی نفقہ نہیں ملے گا کی تصدیق ہی چاہی ہوگی۔ اب یہ قاضی حربویہ جانیں کہ انھوں نے کہنے کے بعد انکار کر دیا یا منصور فقیہ اس کے ذمہ دار ہیں کہ انھوں نے قاضی کی طرف اس کو غلط منسوب کر دیا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا مگر بہر حال طحاوی کو اس فتنہ کا ذمہ دار ٹھیرانا خود فتنہ پردازی ہے ابن خلکان کا بیان ہے کہ:

عدله أبوعبيد علي بن الحسين بن حرب القاضي عقيب القضية اللتي جرت لمنصور الفقيه مع أبي عبيد. ①	طحاوی کی تعدیل قاضی ابوعبید علی بن الحسین بن حرب نے اس قصہ کے بعد کی جو ان کے اور منصور کے درمیان ہوا تھا۔

① وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۲۵، الطحاوی، ج: ۱، ص: ۴۴۔

گویا ادھر ایما ہے کہ امام طحاوی نے اس ہیزم کشی کے ذریعہ سے اپنا رسوخ قاضی حربویہ کے دل میں پیدا کیا اور باوجود حنفی المسلک ہونے اس شافعی التلمذ والمکتب قاضی کے دوست بن گئے اور بیچارے منصور فقیہ شافعی کو ان کی نگاہوں سے گرادیا۔

بالفرض اگر قاضی حربویہ ابوعبید نے الطحاوی کی تعدیل اسی واقعہ کے بعد یا اس واقعہ سے متاثر ہو کر کی جب بھی الطحاوی پر یہ الزام قطعاً بے بنیاد ہے کہ ان کا ارادہ منصو کو قاضی کی نگاہ سے گرانا تھا، امام طحاوی کو یہ کیا معلوم تھا کہ منصور فقیہ جو بات ان کی طرف منسوب کر رہے ہیں اس کے انتساب کا قاضی حربویہ انکار کریں گے اگر وہ انکار نہ کرتے اور کہہ دیتے ہاں میں نے کہا تھا تو پھر فتنہ کا ہے کو کھڑا ہوتا۔ اس لیے میرے خیال میں اس واقعہ کی ذمہ داری ان ہی دونوں شافعیوں (منصور اور قاضی حربویہ) پر ہے طحاوی کا دامن بالکل پاک ہے۔

ماسوا اس کے قاضی حربویہ اور امام طحاوی کے تعلقات میں خوشگواری میرے خیال میں یہ نسبت اس واقعہ کے ایک اور واقعہ سے اگر پیدا ہوئی ہو تو یہ زیادہ قرین قیاس ہے۔

ایک اور واقعہ:

چونکہ امام طحاوی پر اس واقعہ کے ذریعہ سے شوافع نے گویا ایک طرح کا الزام لگانا چاہا ہے اور اپنے ایک عالم کا خون کو ان ہی کی گردن پر ڈالنا چاہتے ہیں، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہاں اس دوسرے واقعہ کا بھی ذکر کردوں جو میرے نزدیک قاضی حربویہ کی ہمدردی کا امام طحاوی کے ساتھ زیادہ تر مناسب ہوسکتا ہے۔

حافظ ابن حجر اور دوسرے محدث مؤرخین کی کتابوں میں یہ واقعہ پایا جاتا ہے، میں ''ملحقات الکندی'' سے اسے نقل کرتا ہوں کہ ماذرائی محمد بن علی جس پر قاضی حربویہ کے اجلاس میں ایک عورت نے شفعہ کا مقدمہ دائر کیا تھا، حج سے جب واپس ہوئے تو پھر قاضی حربویہ نے اس پر

یورش کی اور کوئی صاحب اسحاق بن ابراہیم رازی تھے ان کو قاضی جی نے ماذرائی کے پاس یہ کہلا کر بھیجا کہ ''فصل القضیۃ او الحضور'' یعنی یا عورت کا حق ادا کرو ورنہ اجلاس میں آ کر جواب دہی کرو۔ اب یہاں سے قصہ شروع ہوتا ہے۔ امام طحاوی اور ماذرائی میں مراسم تھے اس نے ان سے مشورہ لیا۔ آپ نے فرمایا کہ جواب میں قاضی کو کہلا بھیجو کہ میرے دو وکیل قاضی کے اجلاس پر حاضری دینے کے لیے تیار ہیں (یعنی اظہار بالوکالت بھی ہوسکتا ہے) یہ ہی جواب دیا گیا۔ قاضی صاحب کو ضد تھی کہ ماذرائی کو خود اجلاس میں لانا چاہیے، انھوں نے کہلا بھیجا کہ ''الوکیل لا یحلف'' (وکیل قسم نہیں کھا سکتا) یعنی مجھے تم سے قسم کہلوانی ہے اور شریعت کا مسئلہ ہے کہ وکیل سے قسم نہیں لی جاتی، یہ عالمانہ پینترا تھا جو قاضی حربویہ نے کیا مگر یہاں بھی امام طحاوی جیسا مرد میدان موجود تھا انھوں نے ماذورائی سے کہا کہ کہلا بھیجو کہ آپ میرے پاس دو گواہوں کو بھیج دیجئے، میں ان کے پاس قسم کھا لوں گا، قانونی جواب اس کا ممکن نہ تھا یہ زبردستی کا جواب کہلا بھیجا۔

لا سبیل إلی إرسال الشاهدین. گواہوں کے بھیجنے کا سامان اس وقت نہیں ہوسکتا۔

ماذورائی نے امام طحاوی کے اشارہ سے اس کے جواب میں کہلا بھیجا کہ:

أرسلت إلی غیری بشاهدین. میرے سوا آپ نے دوسرے کے پاس دو گواہ بھیجے ہیں۔

قصہ یہ تھا کہ اس سے پہلے زیادۃ اللہ بن اغلب مشہور افریقی انقلابی کے لیے قاضی حربویہ گواہ بھیج چکے تھے جواب کیا دیتے، کہلا بھیجا کہ اس وقت کچھ سیاسی مجبوریاں اور مصالح تھے اس کی تفصیل بھی بیان کی جو طویل داستان ہے آخر میں قاضی نے یہ بھی اضافہ کیا کہ تم ہی اگر زیادۃ اللہ بن

اغلب کا رنگ اختیار کرتے ہو اور تم سے بھی ملک کو، حکومت کو وہی اندیشے پیدا ہو جائیں جو اس سے تھے تو اس وقت تمہارے پاس بھی دو گواہوں کو بھیجوں گا۔ چونکہ قاضی صاحب کو مسلسل خبریں پہنچائی جارہی تھیں کہ ماذورائی بیچارہ شریعت کے مسائل کیا جانے در پردہ ابوجعفر طحاوی یہ سارے جوابات سکھا رہے ہیں اس لیے جس وقت قاضی صاحب کا قاصد ماذورائی کے پاس جارہا تھا بے ساختہ ان کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا۔

تَعِسَ من لَقَّنَكَ. تباہ برباد ہو وہ جو تجھ کو سکھا پڑھا رہا ہے۔

امام طحاوی تک قاضی حربویہ کا یہ فقرہ پہنچا دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ ان کے علم وفضل اور دین وتقویٰ کا وہ اتنا احترام کرتے تھے کہ اس دفعہ قاضی کے جواب الجواب کے لیے ماذورائی نے امام طحاوی کے پاس آدمی بھیجا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ ماذورائی کی جو حالت اس وقت مصر میں تھی اس کا صحیح اندازہ ہم نہیں کر سکتے، ان ہی کتابوں میں لکھا ہے کہ جس زمانہ کا یہ ذکر ہے اس وقت مصر میں اصل حکومت ماذورائی ہی کی تھی، ① لیکن ایک عالم کے مقابلہ میں ایک امیر کی امام نے قطعاً پروانہ کی اور پھر اس کا جواب انھوں نے نہیں بتلایا بالآخر ماذورائی کو عورت کے سامنے جھکنا پڑا②، امام طحاوی کے اس طرز عمل کی یہی خبر قاضی حربویہ کو دی گئی، میرے خیال میں اگر قاضی حربویہ کے دل میں امام طحاوی کے لیے نئی ہمدردی کا کوئی جدید سبب تلاش کرنا ضروری ہی ہے تو بجائے منصور فقیہ والے واقعہ کے جس میں قاضی حربویہ کے ساتھ طحاوی کی طرف سے کوئی ایسی

---

① ابن زولاق کے لفظ ہیں کہ کان محمد بن علی هو امیر البلد فی الحقیقة۔ (ملحق الکندی، ص: ۵۲۷)

② کہتے ہیں کہ جب ماذورائی سے جواب نہ چلا تو حربویہ کو غصے میں اس نے پیغام بھیجا کہ، ما احضر فلیضع ما شاء، میں ان کے اجلاس میں نہیں حاضر ہوں گا، ان کا جو جی چاہے کریں۔ قاضی صاحب نے عورت کو حکم دیا کہ جس وقت بازار میں جارہا ہو اس کی سواری کی لگام تھام کر کھڑی ہو جائے۔ اس نے یہی کیا، ماذورائی کی یہ رسوائی تھی، بیچ کے کچھ لوگوں نے پڑ کر معاملہ کو سمجھا دیا۔ عورت کو روپے دلوا دیے۔

بات نہیں ظاہر ہوئی تھی جس سے قاضی کو ان سے ہمدردی پیدا ہوتی۔ اگر اس واقعہ کو یعنی ماذورائی کے قصہ کو ان کی ہمدردی کا سبب ٹھیرانا چاہئے تو یہ زیادہ قرین قیاس ہے۔

بہر حال کچھ بھی ہو، قاضی حربویہ نے شہود کی غیبو بت سے نفع اٹھانا چاہا اور ان متعسفین گواہوں نے طحاوی کو غیر عادل قرار دے کر ان کا نام جو دیوان شہود سے کٹوا دیا تھا ارادہ کیا کہ اس رسوائی کا ازالہ کیا جائے جیسا کہ ابن خلکان کے حوالہ سے میں نے نقل کیا ہے کہ اس سال الشہود کی بڑی جماعت مکہ معظّمہ میں مجاور تھی، ابن خلکان نے اس کے بعد لکھا ہے کہ:

فاغتنم أبو عبيد غيبتهم. ابوعبید نے ان کی غیبو بت کو غنیمت خیال کیا۔

اور مصر کے دو مشہور نامی آدمی ابوالقاسم المامون اور ابوبکر بن سقلاب جو وہاں موجود تھے ان دونوں کو بلا کر انکی شہادت سے امام ابوجعفر طحاوی کی تعدیل کرادی۔ ① اور یوں رسوائی کا جو داغ امام کے دامن عزت پر حاسدوں نے لگایا تھا قاضی حربویہ کی مدد سے دھل گیا۔ غالبًا اس کے بعد قدرتی طور پر امام طحاوی اور قاضی حربویہ کے تعلقات میں زیادہ گہرائی پیدا ہوتی چلی گئی اور آخر میں اس کی انتہا یہ تھی کہ جب قاضی حربویہ عہدہ قضا سے ہٹنے کے بعد درس وتدریس میں مشغول ہوئے اور مصر میں املاء کا حلقہ قائم کیا تو امام ابوجعفر جن کی عمر اس وقت ۷۵ سے زیادہ تھی، ان کے حلقہ میں بحیثیت شاگرد اور مستفید کے بیٹھنے لگے۔ ابن یونس محدث کے حوالہ سے ''ملحقات کندی'' میں منقول ہے کہ:

''قاضی حربویہ جب قضاء کے عہدے سے ہٹے تو لوگوں کو املاء کرنا شروع کیا اور ان کی حدیثیں لکھیں، ان سے ابوبشر دولابی، ابوجعفر طحاوی ابوحفص بن شاہین جیسے لوگ راوی ہیں ②۔''

اگر چہ اس زمانہ خصوصاً حدیث کی روایت میں عمر کی زیادتی کا چنداں خیال نہیں کیا جاتا تھا۔

① وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۲۵، الطحاوی، ج:۱، ص:۴۴۔

② ملحقات الکندی، باب علی بن الحسین بن حرب، ص:۵۲۴۔

محدثین تو ایک باب ہی ''روایۃ الأ کابر عن الأ صاغر'' کا باندھتے ہیں اور یہاں تو گویا امام طحاوی بہت معمر ہو چکے تھے لیکن حربویہ سے تو عمر میں پھر بھی تقریباً ۱۴ سال چھوٹے تھے، نیز حربویہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ بعض سلسلہ ان کی روایتوں کی سند کا بہت عالی تھا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اوران میں وسائط نسبتاً کم تھے۔ظاہر ہے کہ محدثین کے یہاں سند عالی تو کیمیا کا حکم رکھتی ہے۔

⑤

قاضی حربویہ اور امام طحاوی میں بے تکلفی:

اور صرف استاذی وشاگردی نہیں بلکہ جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے، امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ قاضی حربویہ کی جلالت شان اور خاص طبیعت کے باوجود ان سے بہت مانوس اور شوخ ہو گئے تھے، جس کا ثبوت ایک تو اسی مذاکرہ ''تقلید'' سے ہوتا ہے، نیز طحاوی خود ہی بیان کرتے ہیں کہ حربویہ سے میں بہت کھل کھل کر باتیں کرتا تھا۔اسی سلسلہ میں ایک دفعہ ذرا قاضی صاحب طحاوی پر جھنجھلا بھی گئے، قصہ یہ ہے کہ جب دونوں میں مراسم بے تکلفی کی حد تک پہنچ گئے تو مختلف مسائل کے سلسلہ میں امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے اساتذہ کے اقوال وآراء کو بھی بطور سند کے حربویہ کے سامنے پیش کیا کرتے تھے جیسا کہ گذر چکا۔طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے استادوں میں ایک عالم ومحدث ابن ابی عمران بھی تھے چونکہ ان ہی سے امام مزنی کے یہاں سے ہٹنے کے بعد طحاوی نے زیادہ نفع اٹھایا تھا اس لیے قدرتی طور پر مذاکروں میں وہ ان کے حوالوں سے اکثر چیزیں بیان کرتے تھے۔ غالباً قاضی حربویہ کو اپنے نظریات کے مقابلہ میں ابن ابی عمران کے قول کا پیش کرنا کچھ گراں گزرتا تھا مگر طحاوی کے لحاظ سے اپنے اس جذبہ کا اظہار نہیں کرتے تھے مگر آخر کب تک، ایک دن جب گفتگو کی مجلس گرم تھی حسب دستور اس وقت بھی مسلسل طحاوی قال ابن ابی عمران کہتے

جارہے تھے، قاضی کے لیے آخر یہ ان کا طرز عمل نا قابل برداشت ہوگیا اور برہم ہوکر بولے:

إلى كم تقول قال ابن أبي عمران وقد رائت هذا الرجل بالعراق.

تم کب تک بولتے جاؤ گے ابن ابی عمران نے یوں کہا یوں کہا میں نے اس شخص کو عراق میں دیکھا تھا۔

مطلب یہ تھا کہ بھائی آپ کے استاد ابن عمران کو میں سرزمین عراق میں دیکھ چکا ہوں بیچارہ وہاں تو معمولی آدمی تھا اور اس کے بعد تو قاضی کی زبان سے ایک ڈھلا ہوا یہ فقرہ نکل پڑا:

إن البغاث بأرضكم تستنسر.

تمہاری سرزمین میں تو ایسی چڑیا جس کا کوئی شکار نہیں کرتا یہاں پہنچ کر گدھ بن جاتی ہے۔

امام طحاوی کا بیان ہے کہ یہ فقرہ قاضی حربویہ کی زبان سے کچھ اس طرح بے ساختہ نکلا کہ مصر میں اس فقرہ نے بھی ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لی۔① اور شاید اب بھی اس کا شمار عربی کی مثل السائر میں ہو، گویا حربویہ کی بدولت ایک تو تقلید والا فقرہ اور دوسرے یہ دونوں ضرب المثل بن گئے۔

قاضی حربویہ کا بن ابی عمران کے متعلق ایک مدت کے ضبط کے بعد اتنی بات کہنی کوئی معمولی بات نہ تھی جس شخص کی حیا اور شرم کی یہ حالت ہو جیسا کہ بیان کر آیا ہوں کہ کسی نے کھاتے پیتے وضو کرتے ان کو نہیں دیکھا حد یہ تھی کہ خادم کو بھی بلانے کا خاص طریقہ تھا۔ ابن زولاق ہی کی روایت ہے کہ قاضی ابن الحداد مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے قاضی حربویہ کے گھر کے لوگوں سے پوچھا کہ جب کوئی ان کو کھاتے پیتے نہیں دیکھتا تو کیا نوکر بھی نہیں دیکھتے قاضی آخر کرتے کیا ہیں۔ ان کے گھر کے لوگوں نے بیان کیا کہ قاضی کے پاس کوئی خاص برتن تھا جو سرپوش سے چھپا رہتا تھا اس میں قاضی صاحب کے کھانے پینے کی چیزیں رہتی تھیں، خادم کمرے میں اس کو رکھ

① ملحقات الکندی، علی بن الحسین بن حرب، ص: ۵۲۹۔

آتا، قاضی اندر چلے جاتے جب فارغ ہوتے تو آواز دے کر خادم کو نہیں بلاتے بلکہ:

فإذا فرغ يأكل نقر المائدة بإصبعه فيدخل الغلام فيرفع المائدة ويأتي بالطشت ويخرج.	جب کھانے سے فارغ ہوجاتے تو میز پر انگلی مارتے اس کی آواز سن کو غلام اندر جاتا اور میز کو اٹھالیتا اور طشت لاکر دیتا پھر باہر ہوجاتا۔

قاضی تنہائی میں جب اچھی طرح ہاتھ منہ دھو لیتے تو پھر وہی طشت کو انگلی سے ٹھکراتے تب غلام داخل ہوتا اور طشت کو اٹھا کر لے جاتا۔

یہ تو کھانے پینے کے آداب تھے، وضو وغسل وغیرہ کے متعلق بھی کہتے ہیں کہ آفتابہ یا لوٹا جو برتن ہو اس کو ٹھوکر سے بجا کر نوکر بلایا جاتا اور رخصت کیا جاتا۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جس کے شرم کا یہ حال ہو کہ خادم کے بلانے میں بھی حیا آتی ہو، طحاوی سے اتنی گفتگو بھی انھوں نے گویا بہت زیادہ تحمل اور ضبط کے بعد کی ہوگی، اور اس سے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی جو عظمت ان کے قلب میں تھی اس کا پتہ چلتا ہے۔

قاضی حربویہ عہدہ قضا سے جدا ہونے کے بعد کچھ دن اور مصر میں رہے، پھر بغداد ہی واپس ہوگئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد چونکہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر زیادہ ہوگئی تھی اور قاضی حربویہ کی قدر افزائیوں نے ان کی عظمت وجلالت کو اور دوبالا کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاضی حربویہ کے جانے کے بعد مصر میں امام طحاوی کے ہم پلہ شاید ہی گنتی کے دو تین آدمی رہ گئے ہوں، عام طور پر اب صرف عوام ہی میں نہیں بلکہ خواص میں بھی ان کی بڑی آؤ بھگت ہونے لگی اور رفتہ رفتہ مصر ہی نہیں بلکہ بغداد میں بھی ان کا شمار مصر کے ارباب حل وعقد اور چیدہ لوگوں میں ہونے لگا، کہا جاتا ہے کہ قاضی حربویہ کی جگہ جب بغداد سے خاص اسباب کے ماتحت ابن مکرم نامی ایک نوجوان ناتجربہ کار عالم قاضی مصر کا بنا کر بھیجا گیا تو اسی کے ساتھ خلیفہ وقت کے وزیر ابوالحسین

ابن الفرات نے ایک مراسلہ بھی اس لیے جاری کیا کہ گو قاضی تو ابن مکرم ہی رہیں گے لیکن چونکہ ابھی نوآموز ہیں اس لیے نیابت میں کسی پختہ کار عالم کا بھی تقرر کیا جائے۔ ابن الفرات نے اس مراسلہ کو مصر کے چار سربرآوردہ لوگوں کے نام جاری کیا تھا، ان چاروں میں ایک نام طحاوی کا تھا۔①

خیر ان چاروں نے مل کر نائب قاضی کے لیے جس کا انتخاب کیا اور جس طریقہ سے کیا یہ ایک طویل قصہ ہے، مجھے تو صرف امام طحاوی کے اس مقام ومنزلت کو بتانا ہے جو ان کو مصر میں اب حاصل ہوگئی تھی کہ عباسی خلافت کا وزیر بغداد سے ان پر اعتماد کرتا تھا اور یہ واقعہ تو اس وقت کا ہے جب قاضی حربویہ ابھی مصر میں ہی ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ ممالک محروسہ عباسیہ میں ان کی شہرت قاضی حربویہ کے عہد ہی میں ہو چکی تھی۔

گذشتہ بالا واقعات سے ایک نتیجہ یہ بھی پیدا ہوتا ہے اور میرے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ محمد بن عبدہ کا سکریٹری ہونے کے بعد پھر امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حکومت سے ملازمت اور عہدہ داری کے تعلق نہ پیدا کرنے کا ارادہ قطعی طور پر طے کر لیا تھا ورنہ ابن الفرات وزیر خلافت عباسیہ نے جہاں ان کو نائب قاضی کے انتخاب کے لیے مراسلہ بھیجا تھا یہ ہی کیوں نہیں کیا کہ خود ان ہی کو قاضی بنا دیتا۔ اس لیے کہ بغداد تک طحاوی کی جو شہرت پہنچی ہوگی ظاہر ہے کہ وہ دولت وامارت کی تو ہوگی نہیں بیچارے ایسے کہاں کے امیر تھے۔ لامحالہ یہی ماننا پڑے گا کہ علم وفضل نے ان کے نام کو اونچا کیا تھا اور جب ان کا علم وفضل مسلم تھا تو نائب قاضی ہونے کی صلاحیت ان سے زیادہ اور کس میں ہوسکتی تھی خصوصاً جب قاضی بکار اور قاضی محمد بن عبدہ دو زبردست قاضیوں کے سکریٹری کا کام ایک زمانہ تک یہ انجام دے چکے تھے نیز اگر ان کی خواہش ملازمت کی ہوتی تو جب ان کو

① ملحقات الکندی، عبداللہ بن ابراہیم بن مکرم، ص: ۵۳۲۔

بھی بغداد سے نیابت کے انتخاب کا اختیار دیا گیا تھا تو اپنے رفقاء کار کو بآسانی ہموار کر کے خود اس عہدہ پر قبضہ کر سکتے تھے۔

بہر حال میرا خیال یہی ہے کہ اس ملازمت اور اس کے بعد جو تلخ تجربات حکومت کے عہدہ کے ان کو دو دو دفعہ ہو چکے تھے اس نے پھر اس چکھی ہوئی چیز کے نگلنے پر ان کو آمادہ نہ کیا، غالباً منجملہ اور وجوہ کے ان کی شان استغنا بھی آئندہ ان کی عظمت پر اثر انداز ہوئی۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی بے تعصبی:

ایک بات البتہ اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے کہ جن چار آدمیوں کی کمیٹی کے سپرد ابن مکرم قاضی کی نیابت کا مسئلہ کیا گیا تھا تو جیسا کہ ابن یونس نے لکھا ہے ان حضرات نے ابوالذکر کا انتخاب کیا تھا①۔ اور یہ ابوالذکر حالانکہ مالکی المذہب تھے اور ابن مکرم اگرچہ جوان تھا لیکن حنفی مذہب رکھتا تھا۔ علامہ طحاوی اگر متعصب آدمی ہوتے تو اتنا ضرور کر سکتے تھے کہ بجائے مالکی کے کسی حنفی کے تقرر کرانے کی کوشش کرتے۔ خصوصاً ایک بڑا نقطۂ بحث ان کا یہ ہو سکتا تھا کہ جب اصل قاضی کا مذہب حنفی ہے تو نائب کو بھی حنفی ہی ہونا چاہیے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا اور باوجود مالکی ہونے کے ابوالذکر محمد بن یحییٰ المالکی کا ہی انتخاب کیا مگر اس رواداری کا اثر یہ ہوا کہ ابوالذکر کو بھی امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس سلوک کا لحاظ کرنا پڑا۔ خصوصاً اس مشہور مسئلہ میں جس ذکر منصور فقیہ کے سلسلہ میں گذر چکا۔ یعنی تین طلاق والی عورت کو نان ونفقہ ملنا چاہیے، چونکہ یہ بڑا اہم تاریخ اختلافی مسئلہ تھا اور احناف اس کو قرآن وسنت اور اجماع سب ہی کے مخالف خیال کرتے تھے اس لیے ابوالذکر باوجود مالکی ہونے اس مسئلہ میں حنفیوں کے مسلک کے مطابق فیصلہ کیا کرتے تھے۔

① ملحقات الکندی، ابوالذکر محمد بن یحییٰ الاسوانی، ص: ۵۳۳۔

بہر حال اب واقعی ابوجعفر طحاوی مصر میں امام طحاوی کے منصب پر پہنچ گئے تھے یا ایک دن مصر ہی میں ان کا حال یہ تھا کہ قاضیوں کی ماتحتی میں کتابت کا کام کرتے تھے۔ محمد بن عبدہ قاضی ان کو ایک خشک لکڑی اور بانس سے کم مرتبہ قرار دیتے ہوئے ڈانٹتا ہے اور بیچارے خاموش ہو جاتے ہیں اور اب اسی مصر میں ان کے سامنے حق تعالیٰ کی شان دیکھئے کہ وہ دن آیا کہ ابن مکرم کے بعد جب مصر کے قاضی عبدالرحمٰن بن اسحاق الجوہری بغداد سے مقرر ہو کر آئے تو اگرچہ یہ علاوہ فقیہ ومحدث ہونے کے فن حساب میں بھی جس سے علماء کو کم لگاؤ ہوتا ہے ماہرانہ واقفیت رکھتے تھے اور بڑی جلالت قدر وعظمت شان کے مالک تھے مگر اس کے باوجود امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا اتنا ادب کرتے تھے کہ وہ اس وقت تک سوار نہیں ہوتے تھے جب تک طحاوی سوار نہ ہو لیتے اور اسی پر اکتفا نہیں بلکہ اپنے اجلاس میں جب وہ ہر طرح کے لوگوں نے بھرا ہوتا طحاوی کے متعلق یہ الفاظ کہتے:

''ھو عالمنا ھو قدوتنا اور پھر فرماتے کہ قضا کوئی ایسا عہدہ نہیں ہے جس کی وجہ سے میں ابوجعفر (طحاوی) کے مقابلہ میں فخر کروں۔''

عبدالرحمٰن بن اسحاق تو مسلکاً حنفی بھی تھے اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی ساری عمر جو اَب قریب اسی ۸۰ کے پہنچ چکی تھی حنفی مذہب کی تائید میں ہی گذری تھی، بیسیوں کتابیں جن کا ذکر آگے آتا ہے وہ اس وقت لکھ چکے تھے پھر عمر میں بھی امام طحاوی سے کم تھے۔

لیکن جب عبدالرحمٰن بن اسحاق کا دور ختم ہو گیا اور ایک مالکی قاضی احمد بن ابراہیم کا مصر کی قضائت پر تقرر ہوا تو خیال ہو سکتا تھا کہ اب شاید طحاوی کی اتنی عظمت وہ نہ کریں گے مگر مصر والوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ احمد بن ابراہیم تو عبدالرحمٰن قاضی سے بھی دو قدم آگے بڑھ گئے یعنی علاوہ معمولی تعظیم وتکریم کے وہ امام طحاوی کے باضابطہ شاگرد بن گئے اور باوجود قضاء مصر کے جلیل عہدہ پر ہونے کے ان کے علم سے جس کی واقعی نظیر سے اس وقت اگر دنیا

میں نہیں تو مصر میں یقیناً موجود نہ تھی۔ استفادہ کرنے سے نہیں شرماتے تھے حالانکہ وہ جس قسم کے شرمیلے آدمی تھے اس کا حال آگے آتا ہے اور صرف چند دنوں کے لیے شاگرد نہیں بلکہ جیسا کہ ابن زلاق کا بیان ہے جب تک احمد ابراہیم مصر کے قاضی رہے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھتے رہے۔ ابن زولاق کے الفاظ یہ ہیں:

وكان أحمد بن إبراهيم في طول ولائته يتردد إلى أبي جعفر الطحاوي يسمع عليه تصانيفه بقراة الحسن بن عبدالرحمن وهو يومئذ قاضي مصر.①	احمد بن ابراہیم جب تک قضا کے عہدہ پر رہے وہ ابوجعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آتے جاتے رہتے تھے اور خود ان کی کتابیں ان ہی سے سنتے تھے، پڑھنے والے حسن بن عبدالرحمٰن ہوتے اور یہ اس زمانہ کا قصہ ہے جب احمد بن ابراہیم مصر کے قاضی تھے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام طحاوی اپنی کتابوں کا درس خود اپنے زمانہ میں دینے لگے تھے اور صرف حنفی مذہب کے علماء ہی نہیں بلکہ دوسرے مسالک کے اہل علم بھی ان کی کتابوں سے علماً استفادہ اپنے لیے ضروری سمجھتے تھے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ قاضی احمد بن ابراہیم کوئی معمولی آدمی تھے، اپنے عہد کے جلیل القدر محدثین میں ان کا شمار ہے۔ ابراہیم الحربی جیسے محدثین سے روایت کرتے تھے۔

مگر باوجود اس عظمت واقتدار کے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے علم صادق نے نہ پہلے نہ درمیان میں نہ اس زمانہ میں ان کے اندر کسی علمی خودی یا کبر کو پیدا نہیں ہونے دیا دوسرے ان کی جتنی بھی عظمت وعزت کرتے ہوں لیکن اپنے کو وہ ہمیشہ مصر کے دیہات کا ایک دیہاتی ہی سمجھتے رہے۔ یہی احمد بن ابراہیم جیسا کہ گذر چکا ان کے شاگرد تھے اور کیسے شاگرد کہ گھر پر بلا کر ان سے نہیں پڑھتے

① ملحقات الکندی، احمد بن ابراہیم بن حماد، ص: ۵۳۸۔

بلکہ روزانہ خود طحاوی کے حلقہ میں عام لوگوں نے ساتھ بیٹھ کر ان کے درس کو سنتے تھے۔ایک دن حسب معمول حلقہ درس میں بیٹھے تھے، احمد بن ابراہیم بھی شاگردوں کی صف میں آ کر بیٹھ گئے، درس ہو رہا تھا کہ اتنے میں اسوان — جو مصر کا مشہور مقام ہے — وہاں کا کوئی آدمی آیا اور اس نے کوئی سوال کیا۔ظاہر ہے کہ سوال امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ سے تھا لیکن امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیکھ کر کہ اس مجلس میں بہر حال مصر کا قاضی اعظم بیٹھا ہوا ہے مفتی الدیار المصر یہ کا عہدہ اسی کا ہے، اس لیے سائل کا جواب تو دیا مگر الفاظ یہ تھے: ''قاضی صاحب خدا ان کی مدد کرے ان کا خیال یہ ہے''۔مگر سائل بھی مفصلات کا ایک دہقانی آدمی تھا، بوڑھے عالم کی اس کسر نفس وتواضع کو دیکھ کر صبر نہ کر سکا اور جھنجھلا کر بولا ''میں قاضی کے پاس نہیں آیا ہوں تمہارے پاس آیا ہوں'' اس پر قاضی احمد بن ابراہیم بھی امام کے اس از حد گذشتہ تواضع کو دیکھ کر اسوانی کو مخاطب کر کے بولے (یا ہذا ہو کما قلت) بات وہی ہے جو تم نے کہی اور حکم دیا کہ پھر اپنے سوال کو دھراؤ، اس نے دہرایا تب امام کی طرف احمد بن ابراہیم مخاطب ہوئے اور ان کی ایدک اللہ کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا:

افتی أیدك الله برائك. — خدا آپ کی مدد کرے فتویٰ اپنی رائے سے دیجئے۔

مگر اس پر بھی امام طحاوی کی فطری افتاد کا تقاضا نہ گیا اور قاضی صاحب کی طرف متوجہ ہو کر بولے:

إذا أذن القاضي أیده الله أفتیته — اگر قاضی (خدا ان کی مدد کرے) اجازت دیں تو میں اس شخص کو فتویٰ دے سکتا ہوں۔

اس تمہید اور اظہار ادب کے بعد انھوں نے اس بیچارے اسوانی سائل کا جواب دیا۔ابن زولاق نے اس واقعہ کو درج کرنے کے بعد لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے کہ:

کان ذلك یعد من أدب الطحاوي — اس طرز عمل کو طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے فضائل اور ادب

وفضله.① میں شمار کیا جاتا ہے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے ادب شناس، قدر فرما شاگرد احمد بن ابراہیم مالکی مصر کے قاضی ۳۱۷ھ تک رہے کہ زمانے نے پھر پلٹا کھایا اور اب جبکہ امام کی عمر اسی ۸۰ سے بھی متجاوز ہو چکی ہے مصر کی ولایت قضاء پر پھر مصیبت آئی۔ ایک شخص عبداللہ نامی جو ابن زبر کے نام سے مشہور تھا اپنی چالاکیوں اور خلیفہ وقت مقتدر باللہ کی سادگی سے نفع اٹھا کر مصر کا قاضی ہو گیا۔ داستان تو اس کی لمبی ہے مختصر یہ ہے کہ مقتدر باللہ کا وزیر علی بن عیسیٰ اس کی حالت سے واقف تھا اس کو خود جب دمشق کے دور پر گیا ہوا تھا اس شخص کا تجربہ ہو چکا تھا۔ دمشق کا اس زمانہ میں ابن زبر قاضی تھا پبلک اس سے تنگ تھی، لوگوں کا وفد وزیر کے پاس اس کی شکایت کرتا ہوا پہنچا۔ علی بن عیسیٰ نے قاضی ابن زبر سے پوچھا لوگ کیا کہہ رہے ہیں بولا کہ گرانی کی شکایت کر رہے ہیں۔ علی بن عیسیٰ کو اس کی کھلی شرارت پر سخت غصہ تھا اس وقت کچھ نہیں بولا اور بغداد پہنچ کر اس کی موقوفی کا حکم بھیج دیا۔ ابن زبر آنے کو تو بغداد آ گیا مگر ایک ایسی چال کر گیا کہ علی بن عیسیٰ کی وزارت ہی ختم ہو گئی۔ ایک خاص ذریعہ سے مقتدر تک ایک تحریر ابن زبر نے پہنچائی جو ایک خراسانی مسافر کی طرف سے تھی جس میں اس خراسانی مسافر کی طرف سے ظاہر کیا گیا تھا کہ تین دن سے میں مسلسل خواب میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو دیکھ رہا ہوں وہ ایک عمارت بناتے ہیں لیکن ایک شخص اٹھ کر اس کو ڈھا دیتا ہے۔ میں نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ یا عم رسول اللہ یہ آپ کو کون ستا رہا ہے فرمایا کہ علی بن عیسیٰ وزیر۔ میں اپنے لڑکے کے لیے عمارت بناتا ہوں اور وہ گرا دیتا ہے، ایسی بے لاگ ترکیب سے یہ تحریر سادہ لوح مقتدر تک پہنچی کہ مقتدر چیخ اٹھا اور اس نے علی بن عیسیٰ کو وزارت سے الگ کر دیا۔ وزیر علی بن عیسیٰ حیران تھا مگر کیا کرتا اور خواب کا جواب کیا دیتا۔ علی بن عیسیٰ ہی

① ملحقات الکندی، احمد بن ابراہیم بن حماد، ص: ۵۳۸۔

ابن زبر کی راہ کا کانٹا تھا، اس کا ہٹنا تھا کہ وہ مصر اور دمشق دونوں کا قاضی ہو گیا۔①

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی بدقسمتی تھی کہ زندگی کی آخری گھڑیوں میں قاضی ابن زبر جیسا چال باز مکار آدمی مقرر رہو کر آیا۔ آنے کے ساتھ ملک میں رشوتوں اور مظالم کا بازار گرم ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نجس سیاہ سینہ قاضی کے عہد میں امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ گوشہ گیر ہو گئے اور حکومت سے اتنے کنارہ کنارہ رہنے لگے کہ پہلے قضاۃ سے کچھ مراسم سوال و جواب اور علمی مذاکرات کے جو رہتے تھے اس بھی دست بردار ہو گئے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ایک دفعہ ابن زبر نے شہر کے سب سے بڑے عالم خیال کر کے کوئی استفتاء امام کے پاس بھیجا لیکن امام نے اس کا تسلی بخش جواب نہیں دیا۔

اسی ابن زبر کے زمانہ میں ایک اور واقعہ بھی پیش آیا یعنی قاضی محمد بن عبدہ جن کے امام طحاوی سکریٹری تھے ان کے زمانہ کا کوئی طے شدہ مقدمہ تھا اسی کے متعلق ابن زبر کے زمانہ میں بھی کوئی معاملہ چھڑا۔ ضرورت اس کی ہوئی کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اس مقدمہ میں خود محکمہ قضاء میں حاضر ہو کر اپنا بیان دیں۔ ابن زبر نے ان کو بلا بھیجا۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ سوار ہو کر اس کے اجلاس میں گئے اور گواہی دی۔

آگے جس واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن زبر کی امام طحاوی سے یہ پہلی ملاقات تھی اور فتویٰ جو اس نے دریافت کرایا تھا وہ محض ان کی علمی شہرت و جلالت کی بنیاد پر تھا، خواہ براہ راست نہ قاضی ان سے ملا اور امام تو اس سے خود کیا ملتے۔ بہر حال جب اظہار ہوا تو قاضی ابن زبر امام کی طرف متوجہ ہوا اور جیسا کہ چاہیے، ان کے ساتھ اس نے ملاطفت اور تکریمی برتاؤ کیا۔ اسی سلسلہ میں امام کو خوش کرنے کے لیے اور کچھ اپنی حدیث دانی کا اثر قائم کرنے کے

① ملحقات الکندی، عبداللہ بن احمد بن زبر، ص: ۵۴۱۔

لیے بولا کہ تیس سال ہوئے آپ کے واسطہ سے ایک حدیث ایک شخص کے ذریعہ سے مجھے پہنچی ہے۔

خدا جانے ابن زبر کا یہ دعویٰ صحیح بھی تھا یا صرف امام کو مسرور اور کچھ اپنے علمی و دینی شوق کے ثبوت میں یہ لطیفہ اس نے گھڑ لیا تھا کیونکہ محدثین ابن زبر کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کی یہ عام عادت تھی کہ کسی ایک حدیث کے متن کا ٹکڑا اس میں دوسری سند لگا دیا کرتا تھا اور یوں حدیثوں میں جعل بنایا کرتا تھا۔ امام الدار قطنی نے اپنا چشم دید واقعہ اس شخص کے متعلق یہ درج کیا ہے کہ میں ابن زبر کے پاس حاضر ہوا مگر اس وقت میری عمر کم تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے سامنے ایک کاتب بیٹھا ہوا ہے اور ابن زبر اس کو حدیث املا کرا رہا ہے مگر طریقہ لکھانے کا عجب تھا یعنی حدیث ایک جزء سے لکھاتا اور سند دوسرے جزء سے۔

ایسی صورت میں کیا عجب ہے کہ امام طحاوی کو دیکھ کر اس نے ان کے کسی شاگرد کی طرف اس حدیث کو منسوب کر کے روایت کر دیا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام سے ابن زبر نے پھر اس کی بھی درخواست کی کہ یوں تو حضور کا میں بالواسطہ شاگرد ہی ہوں لیکن اگر جناب والا براہ راست تلمذ کے شرف سے سرفراز فرمائیں تو بندہ نوازی ہوگی۔ بوڑے امام کا دل حالانکہ اس کمینہ فطرت بدنام کنندہ اسلام و امت اسلامیہ سے چڑا ہوا تھا، حالات سب معلوم تھے مگر مروتاً کہا جاتا ہے کہ امام نے اس سے بھی چند حدیثیں روایت کیں۔

اور یہ تو اس وقت ہے جب ابن زولاق کے الفاظ فحدث بہ میں حدث کا فاعل امام طحاوی کو قرار دیا جائے جو متبادر ہے لیکن اگر اس کا فاعل ابن زبر ہی ہو اور مطلب یہ لیا جائے کہ جس حدیث کے متعلق اس نے باور کرایا تھا کہ بالواسطہ آج سے تیس سال پہلے میں نے اس کو لکھا ہے، یہ بتانے کے لیے میں اس کو بھولا نہیں ہوں یعنی آپ کا بڑا قدر دان ہوں، اس کے ثبوت میں اس حدیث کو

زبانی امام کے سامنے اس نے پڑھ دیا ہو تو اس مطلب کی بھی گنجائش ہے، بلکہ اگر بلا واسطہ شاگرد بننے کی بھی خواہش ہے تو عرض علی الشیخ کے طور پر اس کی سند بجائے باواسطہ کے امام طحاوی کے ساتھ بلا واسطہ متصل ہو جاتی ہے۔

قاضی ابن زبر کے متعلق ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ جناب کی تصنیفات عالیہ میں ایک کتاب ''تشریف الفقر علی الغناء'' ① بھی ہے، الذہبی نے جہاں ان کی کتابوں کی فہرست دی ہے اس کتاب کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔

عجیب بات ہے کہ ٹھیک جس سال امیر تکین جوان زبر کے پشت پناہوں میں اور مصر کا اس زمانہ میں والی (گورنر) تھا، اتفاق سے مسلول ہو گیا، حالت روز بروز بد سے بدتر ہونے لگی۔ ابن زبر کو اندیشہ ہوا کہ امیر اگر کہیں لڑھک گیا تو مصر کی عام پبلک میری تکا بوٹی کر کے رکھ دے گی، بڑا پریشان ہوا، اس زمانہ میں ایک شافعی عالم اسماعیل بن عبدالواحد پر امیر تکین بہت اعتماد کرتا تھا مصر میں موجود تھے۔ ان کی خوشامد درآمد کر کے اس نے راضی کیا کہ امیر سے میری رخصت منظور کرالو، میں گھر دمشق جانا چاہتا ہوں، وہاں سخت ضرورت ہے اور یہ بھی کہا کہ میری جگہ منصرمانہ طور پر آپ ہی کام بھی کیجئے، اسمٰعیل راضی ہوئے لیکن امیر تکین راضی نہیں ہوتا تھا۔

فلم يزل أبو هاشم يكلم الأمير حتى أذن له في ذلك.

ابو ہاشم (اسمٰعیل بن عبدالواحد) بار بار امیر تکین سے ابن زبر کی چھٹی کی متعلق اصرار کرتے رہے تا اینکہ اس کو رخصت مل گئی۔

رخصت کی منظوری جونہی ملی، ابو ہاشم اسمٰعیل کو اپنا قائم مقام بنا کر سیدھا دمشق بھاگا یہ ۳۲۱ھ کا واقعہ ہے اور خدا کی شان دیکھئے کہ اسی سال حضرت ابوجعفر الطحاوی کی وفات ہوتی ہے، ابن

① یعنی فقیری کو امیری پر ترجیح حاصل ہے۔

خلکان اور دوسرے مؤرخوں کا اتفاق ہے کہ:

وتوفي سنة إحدى وعشرين وثلثمائة	۳۲۱ ہجری میں ان کی وفات ہوئی۔

البتہ ابن زبر مصر سے جان بچا کر اسی سال کے جمادی الاول میں بھاگا ہے اور ہمارے امام کی وفات چونکہ ذیقعدہ کی پہلی تاریخ کو ہوئی جیسا کہ ابن خلکان نے تصریح کی ہے گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ ابن زبر کی روانگی کے سات مہینہ بعد امام طحاوی نے رحلت فرمائی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چند مہینے امام پر مرض الموت کے گذرے کیونکہ ابن زبر کے بعد جمادی الثانی ۳۲۱ھ میں مشہور اسلامی مصنف عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ الدینوری المعروف بابن قتیبہ کے صاحبزادے احمد بن عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ کو ہم مصر کا قاضی پاتے ہیں۔ ابن خلکان نے ان ہی ابن قتیبہ قاضی کے متعلق لکھا ہے کہ:

تولى القضاء بمصر وقدمها في ثامن عشر من جمادي الاخرة سنة إحدى وعشرون وثلثمائة.①	مصر کے قاضی مقرر ہوئے اور ۱۸ جمادی الاخرہ ۳۲۱ھ کو وہ مصر پہنچے۔

قاضی ابن قتیبہ قطع نظر اس کے کہ برے باپ کے بیٹے تھے خود اپنے وقت کے مسلم الثبوت علماء اور مصنفین میں شمار ہوتے ہیں، ان کی کتابیں ''ادب الکاتب'' اور ''اصلاح المنطق'' اب بھی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں ایسے علم دوست اور علمی گھرانے کے قاضی سے یہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا جو مقام اس وقت مصر میں قائم ہو چکا تھا ان سے وہ باوجود موانع نہ ہونے کے ملاقات نہ کرتے۔ غالب قرینہ ہے کہ امام کی حالت سقیم ہو چکی ہوگی اور خود بیچارے قاضی ابن قتیبہ کچھ مطمئن بھی نہ تھے۔ رفع الاصر کے حوالہ سے تو یہ نقل کیا گیا ہے کہ مصری جن پر مردانیت کہیے یا جیسا کہ وہ کہتے تھے عثمانیت کا زیادہ غلبہ تھا، قاضی ابن قتیبہ جب قضاء کا چارج

① وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۳۲۸: ابن قتیبۃ، ج:۲، ص:۲۱۔

لینے کے لیے جامع مسجد کی طرف عباسیوں کے مشہور سیاہ رنگ کے لباس میں روانہ ہوئے تو:

فثار علیه العامة فرجعوه و مزقوا سواده.① لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور پتھراؤ کر دیا ان کے سیاہ لباس کو پھاڑ دیا۔

اور اس فرعونی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کہ پانچ مہینہ سے زیادہ قاضی نہ رہ سکے، غالبًا ان ہی پریشانیوں میں وہ الطحاوی کی عیادت کو بھی نہ گئے یا شاید اہل تاریخ نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ خیر کچھ بھی ہو عجیب اتفاق ہے کہ ٹھیک ذیقعدہ ۳۲۱ھ کی پہلی تاریخ کو امام کا انتقال ہوتا ہے اور الکندی کے ''ملحقات'' میں غالبًا ''معجم الادباء'' کے حوالہ سے یہ فقرہ منقول ہے کہ قاضی ابن قتیبہ:

صرف عن القضاء في أخرى ذي القعدة سنة ۳۲۱هـ. مصر کی قضائت سے آخری ذیقعدہ ۳۲۱ھ میں اٹھا دیئے گئے۔

گویا امام طحاوی کی وفات کے پندرہ بیس دن بعد ابن قتیبہ کا بھی عہدہ قضا سے انتقال ہو گیا اور چند ہی دن بعد یعنی ۳۲۱ھ کی ربیع الاول میں دنیا سے بھی چل بسے۔

امام طحاوی کا نسب اور ولایت و وفات:

خلاصہ یہ ہے کہ عرب کے چند قبائل جن کی طرف الازدی کی نسبت کی جاتی ہے۔ ان میں سے ازدجر کا ایک خاندان مصر کے طحا یا طحیۃ جیسا کہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب ''لباب فی تصحیح الانساب'' میں لکھا ہے کہ طحا نہیں بلکہ طحا کے قریب ایک اور گاؤں طحطوطہ ② ہے، وہاں یہ خاندان

① ملحقات الکندی، احمد بن قتیبۃ، ص: ۵۴۶۔

② السیوطی کی اصل عبارت یہ ہے، ''انه (ای) ابو جعفر الطحاوی لیس من طحا بل من طحطوطه قریب من قریة طحا۔ فکره ان یقال له طحطوطی''۔

واللہ اعلم بالصواب سیوطی نے یہ دعویٰ کس بنیاد پر کیا ہے، لیکن خود مصر کے رہنے والے ہیں اس لیے بہر حال ان کے قول میں ایک غیر مصری کو شک کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ بعد کو ایک حنفی عالم جنہوں نے شامی پر حاشیہ لکھا ہے اور طحطاوی کے نام سے ان کا حاشیہ مشہور ہے، اگر امام طحاوی طحطوی کہلاتے تو اس میں کیا حرج تھا۔ آج کل کے۔۔۔

آ کر آباد ہوگیا تھا۔ مجھے اس کا پتہ نہ چل سکا کہ عرب سے منتقل ہو کر شروع شروع میں اس خاندان کے کون آدمی طحا میں آ کر سکونت پذیر ہوئے۔ سلمہ بن القاسم الاندلسی نے اپنی تاریخ میں جو نسب نامہ امام طحاوی کا دیا ہے وہ یہ ہے احمد بن محمد بن سلمہ بن عبدالملک بن سلیم بن سلیمان بن حباب۔

اس سے غالب قرینہ یہ ہے کہ ان میں ساتویں آدمی حباب، البدو سے نکل کر مصر پہنچے، سوا دو صدیوں میں سات پشتوں کا گذر جانا محل تعجب نہیں ہے بلکہ زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ ایک ایک صدی میں تین پشتیں گذرتی ہیں بہرحال اسی خاندان میں ہمارے امام ابوجعفر طحاوی ۲۳۸ھ یا جیسا کہ السمعانی نے ہوالصحیح کہتے ہوئے ۲۳۹ھ کو ترجیح دی ہے، ۱۱ ربیع الاول کو پیدا ہوئے اور تقریباً ۸۲ سال تک اس دنیا کے مختلف نشیب وفراز سے گذرتے ہوئے ۳۲۱ھ یکم ذیقعدہ کو جان جہاں آفریں کے سپرد کی۔ ابن خلکان نے لکھا ہے:

دفن بالقرافة وقبره مشهور بها.① قرافہ میں دفن ہوئے ان کی قبر اس خطہ میں مشہور ہے

اولاد کی پوری تفصیل اب تک مجھے نہیں مل سکی صرف ان کے ایک صاحبزادے ابوالحسن علی بن احمد اور علی بن احمد کے صاحبزادے یعنی امام طحاوی کے پوتے ابوعلی الحسن کا کتابوں میں لوگ تذکرہ کرتے ہیں۔

سمعانی نے لکھا ہے:

''ابوجعفر طحاوی کے بیٹے ابوالحسن علی بن احمد طحاوی وہ ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب النسائی وغیرہ سے حدیث روایت کرتے تھے ۳۵۱ھ میں ان کی وفات ہوئی، ابوجعفر کے پوتے ابوعلی الحسن بن

۔۔۔جدید جغرافیہ مصر میں طحا نامی مقام دریائے نیل کے کنارے پایا جاتا ہے۔ خیال گزرتا ہے کہ طحا اور طحطوطہ بھی اسی کے آس پاس ہی ہوں گے۔ یا ان قدیم مقامات میں سے کسی ایک کا نام طحا باقی رہ گیا۔

① وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۲۵، الطحاوی، ج:۱، ص:۴۴۔

علی بن احمد الطحاوی کا ۳۶۰ھ میں ماہ ربیع الاخر میں انتقال ہوا۔''

خیر یہ تو رسمی حالات ہیں، ہر شخص جو پیدا ہوتا ہے وہ کہیں پیدا ہوتا ہے، کسی سنہ میں مرتا ہے اور کسی مقام ہی میں دفن ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اولاد بھی چھوڑتے ہیں، اسی طرح غربت سے امارت جہل کے بعد علم یہ بھی چنداں خصوصیت کی بات نہیں اور گو عام کتابوں میں امام کے حالات ایک صفحہ دو صفحہ سے زائد نہیں ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس سلسلہ میں ہزار ہا صفحات کے پڑھنے سے جو متفرق اجزاء مجھے ملتے چلے گئے ان کو ایک خاص ترکیب سے جمع کرنے کی غالباً مجھے پہلی دفعہ سعادت نصیب ہوئی، ورنہ جہاں تک میرا مطالعہ ہے اس وقت تک امام کے حالات پر مستقلاً کوئی کتاب نہیں پائی جاتی۔ عامہ اہل تراجم وتذکرات ان کے ترجمہ کو صفحہ در صفحہ پر ختم کر دیتے ہیں اور یہ پہلی دفعہ امام کے حالات کا اتنا زیادہ ذخیرہ ایک جگہ بحمد اللہ جمع ہو گیا۔

لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ پھر اس مسئلہ کی طرف رجوع کروں جس کی طرف شروع سے میں اشارہ کرتا چلا آیا ہوں، مصر کا ائمہ ثلاثہ امام مالک، شافعی اور ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہم کے فقہ سے ابتدائی صدیوں میں جو تعلق رہا ہے اسے تفصیلا بتا چکا ہوں۔ پھر امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ابراہیم اسمٰعیل المزنی الامام اور قاضی بکار کے تعلقات پر میں نے روشنی ڈالی تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ امام مزنی سے جدا ہو کر امام طحاوی قاضی بکار کے سکریٹری بھی رہے اور ان سے پڑھتے بھی رہے۔ اسی زمانہ میں قاضی بکار کا مزنی کی کتاب مختصر کو دیکھ کر حنفی مذہب کی تائید اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تردید میں ایک ''کتاب جلیل'' کی تصنیف میں مشغول ہونا اور اسی کو امام طحاوی اور امام مزنی کے تعلقات کے خراب ہونے کا سبب قرار دیا تھا۔ عجب بات ہے کہ سلف کی جتنی کتابیں اس باب میں اب تک میری نظر سے گذری ہیں، ان میں مزنی اور طحاوی کے درمیان کس مسئلہ پر اختلاف ہوا اس کی تصریح نہیں ملی، صرف بعد کو ابن عساکر ابوسلیمان بن ترب کے حوالہ

سے تاریخ دمشق میں اتنا اضافہ ملا کہ جھگڑے کا سبب یہ ہوا کہ:

تکلم الطحاوي يوما بحضرة المزني في مسئلة فقال له المزني الخ.① — طحاوی نے ایک دن مزنی کے سامنے ایک مسئلہ پر گفتگو کی تو اسی کے بعد مزنی نے ان وہ بات کہی (یعنی جس کا ذکر دوسری کتابوں سے گذر چکا)۔

چونکہ مسئلہ کا لفظ عموماً جب بولا جاتا ہے تو اس سے علمی مسئلہ ہی مراد لیا جاتا ہے اس لیے اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ گفتگو علمی مسئلہ میں ہو رہی تھی لیکن حیرت ہے کہ مولانا عبدالحئ فرنگی محلی نے جن کے ماخذ تقریباً وہی کتابیں ہیں جن سے میں نے مواد فراہم کیا ہے خدا جانے کس سند کی بنیاد پر اپنی کتاب ''الفوائد البہیہ'' میں اس جھگڑے کا ذکر کرتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ،

كان الطحاوی يكثر النظر فی كتب ابی حنيفة فقال له المزنی لا يجئی منك شئی② — طحاوی ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں بکثرت دیکھا کرتے تھے مزنی نے ان کے اس حال کو دیکھ کر کہا، ''تجھ سے کچھ نہ بن آئے گا''۔

اگر مولانا مرحوم کا یہ بیان قیاسی نہیں ہے بلکہ کسی تاریخ حوالہ پر مبنی ہے تو جس نتیجہ تک میں عقلی اور قیاسی قرائن کی روشنی میں پہنچا ہوں اس کی گونہ تاریخی تائید بھی مہیا ہو جاتی ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے کچھ اس میں زلت قلم ہوئی ہے کیونکہ اب تک کسی کتاب میں اتنی صاف صراحت اس مسئلہ کی مجھے نہیں ملی۔ میرا گمان ہے خدا کرے غلط ہو کہ ابن خلکان نے المزنی کے متعلق امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے یہ جو نقل کیا ہے کہ جب مذہب بدلنے کے متعلق ان سے سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں اپنے ماموں مزنی کو دیکھتا تھا کہ (كان يديم النظر إلى كتب ابی

① تاریخ مدینۃ دمشق، رقم الترجمۃ: ۱۵۲، احمد بن محمد بن سلامۃ، ج: ۵، ص: ۳۶۹۔ مکمل عبارت یوں ہے، (بلغنی ان سبب ترکه لمذهب الشافعی انه تكلم يوما بحضرة المزنی فی مسألة، فقال له المزنی: و الله لا تفلح ابدا، فغضب من قول المزنی، و انقطع الی ابی جعفر بن ابی عمران۔)

② الفوائد البهیۃ فی تراجم الحنفیۃ، ترجمۃ: احمد بن محمد بن سلامۃ ابو جعفر الطحاوی، ص: ۳۲۔

حنیفۃ، ص:۴۴) شاید کچھ اسی سے خلط مبحث ہوا ہے اور اسی وجہ سے شروع میں مولانا کے اس قول کو میں نے پیش نہیں کیا۔ قریب قریب شاہ عبدالعزیز صاحب نے بھی یہی کیا ہے (کہ المزنی طحاوی را تعبیر بہ بلادت کرد، ص:۸۰) حالانکہ یہ قیاساً تو کہا جا سکتا ہے لیکن مؤرخین نے اس کی تصریح نہیں کی ہے①۔ بہرحال اگر ان حضرات نے ان فقروں کو کسی معتبر مؤرخ کی کتاب سے نقل فرمایا ہے تو مسئلہ اور زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔

اب میں پھر اس سلسلہ کے آئندہ واقعات پر بحث کرنا چاہتا ہوں، میرا خیال ہے کہ قاضی بکار نے اس وقت جب طحاوی ان کے ساتھ تھے المزنی کی ''مختصر'' کے مقابلہ میں اپنی ''کتاب جلیل'' تصنیف کی، چونکہ اس کتاب کی تصنیف میں بطور مددگار کے امام طحاوی کی شرکت یقینی ہے۔ آخر وہ اسی شافعیت اور حنفیت ہی کے قصہ میں تو اپنے ماموں کے یہاں سے الگ ہوئے تھے اور جیسا کہ میرا خیال ہے جھگڑے میں شدت قاضی بکار کی اسی تصنیف جلیل کی بدولت پیدا ہوئی، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ طحاوی سے زیادہ اس کتاب سے اور کس کو دلچسپی ہو سکتی تھی، مگر جب قاضی بکار عہدہ قضا سے الگ ہو گئے اور ان کی وجہ سے طحاوی بھی مالی مشکلات میں مبتلا ہوئے، میں نے بتایا تھا امام پر جس وقت یہ افتاد پڑی اس وقت تک مزنی زندہ تھے، اس مصیبت میں ہو سکتا تھا کہ اپنے سرپرست قاضی بکار کو حکومت کے عتاب اور ایسے سخت عتاب میں پا کر وہ اپنے ماموں کی پناہ ڈھونڈتے لیکن جہاں تک واقعات سے معلوم ہوتا ہے غیرت مند بھانجے کو ماموں کے الفاظ سے اتنا صدمہ پہنچا تھا کہ اس حال میں بھی وہ ان کی طرف رجوع نہ ہوئے حالانکہ اس حال میں وہ

---

① بعد میں لسان المیزان میں ابن حجر کی یہ عبارت بغیر کسی حوالے کے ملی۔ مزنی و طحاوی کے بگاڑ کی وجہ درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں، ”و ذلك انه كان يقرء عليه فمرت مسئلة دقيقة فلم يفهمها ابو جعفر فبالغ المزنى فى تقريبها فلم يتفق ذلك فغضب المزنى متضجرا“ (رقم الترجمۃ:۸۴۵، ص:۴۱۵) قیاسی طور پر ابتداء میں جس نتیجہ تک پہنچا اتنی خوشی ہوئی کہ بجنسہ انہی الفاظ میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے واقعہ کی تفصیل بیان کی ہے۔

برسوں مبتلا رہے، خدا ہی جانتا ہے کہ اس زمانہ میں ان کے بسر اوقات کی کیا صورت تھی۔ حکومت بگڑی ہوئی، موروثی جائداد پر چچا کا قبضہ، اس لیے جہاں تک میرا قیاس ہے مزنی کی زندگی میں براہ راست تصنیف وتالیف میں مشغول ہونے کا طحاوی کو موقعہ نہ ملا۔ ماموں نے ان کے متعلق جو پیش گوئی ناکامی ونامرادی کی کی تھی ایک طرح سے ان کی زندگی تک گویا پوری ہورہی تھی۔ طحاوی چاہتے ہوں گے کہ کاش! کچھ بھی فرصت میسر ہوتو میں ان کو اپنا جوہر دکھاؤں لیکن بیچارے کو زمانہ کے سخت ہاتھوں نے اس کا موقعہ نہ دیا۔ تا اینکہ طحاوی کو اسی حال میں چھوڑ کر ۲۶۴ھ میں امام مزنی کا انتقال ہوگیا۔ مگر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی مصیبت پھر بھی ختم نہ ہوئی۔ بالآخر خدا خدا کر کے المزنی کی وفات کے بارہ تیرہ برس بعد قاضی محمد بن عبدہ کے زمانہ میں ان کا عسر یسر سے بدلا۔ بجز چند دنوں کے جب خلیفہ ابن ابا نے آپ کو جیل بھیج دیا تھا لیکن یہ ایک فوری مصیبت تھی جو ٹل گئی پھر ان کو اس قسم کی پریشانیوں سے سابقہ نہ پڑا۔ حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ امام طحاوی کو قاضی محمد بن عبدہ کے سکریٹری ہونے کے بعد چوالیس سال کی طویل مدت ایسی ملی جس میں وہ اطمینان سے کام کر سکتے اور اپنی زندگی کے نصب العینوں کی تکمیل کر سکتے تھے۔

امام کی پہلی تصنیف:

یوں تو عام طور پر لوگ ملا علی قاری کے طبقات کے حوالہ سے طحاوی کی تالیفات کے متعلق یہ فقرہ نقل کرتے ہیں کہ:

إن معاني الأثار أول تصانيفه ومشكل الأثار آخر تصانيفه.①

معانی الآثار ان کی پہلی کتاب ہے اور مشکل الآثار آخری۔

ممکن ہے ملا علی قاری نے یہ حوالہ کسی معتبر کتاب سے اخذ کیا ہو لیکن باوجود تلاش کے متقدمین کی

① الاثمار الجنیۃ فی اسماء الحنفیۃ، رقم الترجمۃ: ۶۹، احمد بن سلامۃ، ص: ۱۵۵،

کتابوں میں اب تک مجھے یہ خبر نہیں ملی جیسا کہ امام نے اس کتاب کے دیباچہ میں ص ا پر لکھا ہے۔ یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے معانی الآثار ان لوگوں کو پیش نظر رکھ کر لکھی ہے جو ایمانی کمزوری اور جہالت کی وجہ سے حدیثوں کی صحت کے سرے سے منکر تھے۔ گویا اس کتاب کا براہ راست تعلق حنفی اور شافعی اختلاف سے نہیں ہے کیونکہ خدانخواستہ وہ شوافع کو اہل الالحاد اور ضعفۃ اہل الاسلام کہتے کہہ سکتے ہیں جو حدیثوں کے علمبردار ہیں بلکہ بہ نسبت اور ائمہ کے حدیثوں کے مسئلہ میں گویا زیادہ بدنام وہی ہیں جس کی طرف میں نے تمہید میں کچھ اشارہ بھی کیا ہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس نقطہ نظر سے امام طحاوی کو سب سے پہلے کتاب لکھنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی بلکہ جب واقعات وحالات کا ذکر میں کر چکا ہوں اگر ان کو سامنے رکھا جائے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ سب سے پہلے جس تصنیفی کام کی ان میں صلاحیت اور جس کا سلیقہ پیدا ہوسکتا تھا وہ وہی چیز ہوسکتی ہے جس کی مشق انھوں نے قاضی بکار کی صحبت میں بہم پہنچائی تھی اور جس کی لَو ان کو شروع سے لگی ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے یہ دعویٰ بے جا نہیں کہ امام نے سب سے پہلے جو کتاب لکھی ہے وہ ان کی وہی کتاب ہوسکتی ہے جس کا نام مختصر الطحاوی ہے اور جو آپ کے ماموں المزنی کی کتاب مختصر المزنی کی ٹکر پر لکھی گئی ہے کیونکہ اس کتاب میں تقریباً وہی مضامین بیان کیے گئے ہیں جن پر قاضی بکار کی کتاب مشتمل تھی۔ اپنی مختصر کے دیباچہ میں طحاوی خود ہی ارقام فرماتے ہیں:

جمعت في كتابي هذا أصناف الفقه اللتي	اس کتاب میں فقہ کے ان مسائل کو میں نے جمع
لايسع الإنسان جهلها وبينت الجوابات	کیا ہے جس سے جاہل رہنے کی اجازت کسی
عنها من قول أبي حنيفة وأبي يوسف	آدمی کو نہیں مل سکتی اور میں نے اس سلسلہ میں

ومحمد. جواب دیتے ہوئے ابوحنیفہ ابی یوسف ومحمد کے اقوال درج کیے ہیں۔

یہ دیباچہ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں نقل کیا ہے پھر اس کے شارح احمد بن علی الوراق کے حوالہ سے اس کتاب کے متعلق اتنا اور اضافہ کیا ہے۔

إذا كان هذا الكتاب يشتمل على عامة مسائل الخلاف وكثيرة من الفروع. چونکہ یہ کتاب (مختصر الطحاوی) زیادہ تر خلافی مسائل اور فروع پر مشتمل ہے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں قاضی بکار کی طرح زیادہ تر خلافیاتی فروع پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نقاط نظر سے بحث کی گئی ہے اور سچ پوچھئے تو یہ دراصل المزنی کی مختصر کا قاضی بکار کی کتاب کے بعد دوسرا جواب ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ اس کا بھی نام مختصر ہے بلکہ حاجی خلیفہ نے لکھا ہے کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اس مختصر کو:

ألفه صغيرا وكبيرا ورتبه كترتيب المزني.① مختصر کو دو شکلوں میں لکھا ہے ایک بڑے پیمانہ پر اور ایک چھوٹے پر اور ترتیب اس کی وہی مزنی کی مختصر کی ترتیب ہے۔

گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ قاضی بکار کی کتاب کا مختصر الطحاوی نقش ثانی ہے اس کی مشق اپنے استاد اور قاضی سے کی تھی اسی لیے سب سے پہلے قلم اس پر اٹھانا زیادہ قرین قیاس ہے بلکہ اس کتاب کا لکھنا تو ان کی زندگی کا ایک بڑا نصب العین تھا۔ ماموں کو چھوڑ کر بھاگے تھے انھوں نے نامرادی کی بددعا دی تھی، وہ دکھانا چاہتے تھے کہ جو کمال آپ نے شافعی مذہب میں حاصل کیا ہے اگر میں نے حنفی مذہب میں وہی کمال حاصل کر کے نہ دکھایا تو بات ہی کیا ہوئی۔ مؤرخین باتفاق لکھتے ہیں کہ:

① کشف الظنون، مختصر الطحاوی فی فروع الحنفیۃ، ج:۲، ص:۵۱۷۔

لما صنف مختصره قال رحم الله أبا إبراهيم لو كان حيا لكفر عن يمينه.①

جب طحاوی نے اپنی مختصر تصنیف کی تب کہا کہ ابوابراہیم (یعنی مزنی) پر خدا رحم کرے آج زندہ رہتے تو اپنی قسم کا کفارہ دیتے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ماموں کے دعویٰ اور پیش گوئی کے مقابلہ میں انھوں نے بھی کتاب لکھ کر پیش کی تھی۔ ایسی صورت میں غور کیا جاسکتا ہے کہ موقعہ ملنے کے باوجود بجائے مختصر کے جس سے ان کے ماموں صاحب کی پیش گوئی غلط ہوسکتی تھی وہ کوئی دوسری کتاب کیوں لکھتے۔ ان کا شروع سے نشانہ مزنی اور مزنی کی پیش گوئی ہی تھی۔ بیچارے کو جب تک زمانہ نہ موقع نہ دیا اور یہ اتفاق تھا کہ جب تک امام مزنی زندہ رہے طحاوی ان کی قسم توڑنے کا سامان فراہم نہ کر سکے۔ لیکن جوں ہی ان کو پہلا موقعہ ملا انھوں نے سب سے پہلے شافعی مذہب کے مختصر کے مقابلہ میں ٹھیک انہی ابواب وفصول کے ساتھ جو مزنی نے اختیار کی تھی اپنی مختصر مرتب کی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ پھر عمر بھر اس میں ردو بدل کاٹ پیٹ کا سلسلہ انھوں نے جاری رکھا ہو بلکہ یہ بات کہ طحاوی نے دو مختصر ایک کبیر اور ایک صغیر لکھا ہے، میرا خیال ہے کہ کبیر تو ان کی اصلی کتاب ہے جو اغلب قرینہ ہے کہ قاضی بکار کے قدم بقدم ہوگی پھر بعد کو انھوں نے اسی کو جب سمیٹا ہوگا اسی کا نام مختصر صغیر رکھ دیا ہوگا۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی نے اپنی کتاب بستان المحدثین میں امام طحاوی کے انتقال مذہب کے قصہ کو بیان فرمانے کے بعد یہ جو لکھا ہے کہ مزنی کے حلقہ کو چھوڑنے کے بعد ابوجعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے:

سعی بسیار کرد تا آنکه در فقه مهارت پیدا کرد ومختصر تصنیف نمود که او را

بڑی کوشش کی تا اینکہ فقہ میں بڑی مہارت پیدا کی اور مختصر تصنیف کی جسے لوگ مختصر طحاوی کہتے ہیں۔

① وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۲۵، الطحاوی، ج:۱، ص:۴۴۔

مختصر طحاوی گویند. (ص: ۸۷)

اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب بھی مختصر ہی کو امام طحاوی کی اس تعلیمی جد وجہد کا سب سے بڑا نصب العین سمجھتے ہیں جس میں وہ اپنے ماموں کے یہاں سے الگ ہونے کے بعد مصروف ہوئے۔

حافظ ابن عساکر نے اپنی تاریخ دمشق میں طحاوی ہی کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ طحاوی کہتے تھے:

قرئت قولي الأول فرأيت المزني في المنام وهو يقول يا أباجعفر أغضبتك و كررها مرتين.

میں نے وہ بات پڑھی تو میں نے مزنی کو خواب میں دیکھا کہ وہ فرمارہے ہیں ابوجعفر میں نے تم کو غصہ دلایا، میں نے تم کو غصہ دلایا۔ یعنی دو بار یہی فقرہ ان کی زبان پر جاری ہے۔

بظاہر اس روایت میں بیان کرنے والے نے کچھ اجزا چھوڑ دیئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جب مختصر کی تصنیف سے طحاوی فارغ ہوئے ہیں کیونکہ اس واقعہ کا ذکر اسی کے بعد کیا گیا ہے تو انھوں نے اپنی مختصر میں اپنے اس دعوے کو جان کے اور مزنی کے درمیان بنائے مخاصمت تھی جب اپنی کتاب میں پڑھا اور ماموں کا قدرتی طور پر خیال آیا ہوگا کہ اس مسئلہ میں ان سے جھگڑا ہوا تھا، رات جو جب سوئے تو مزنی کو خواب میں دیکھا کہ وہ فرمارہے ہیں کہ ابوجعفر! میں نے تمہیں غصہ دلا دیا، میں نے تمہیں غصہ دلا دیا۔

کنیت کے ساتھ کسی کو مخاطب کرنا عربی زبان کے محاورہ کی رو سے عزت یا محبت پر ہی دلالت کرتا ہے۔ گویا ایک طرح سے معذرت اور دل کی صفائی دونوں کا اس سے اظہار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ طبعاً جب امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ صبح کو اٹھے ہوں گے، خواب کا خیال آیا ہوگا، پرانا قصہ یاد آیا ہوگا۔ دونوں میں خون کا رشتہ تھا ایسے موقعہ پر اس کا جوش میں آجانا محل تعجب نہیں ہے، ابن عساکر والی

روایت میں اسی کے بعد جو یہ اضافہ ہے کہ طحاوی رحمۃ اللہ علیہ مزنی کی قبر پر گذرے تو کہا اللہ رحم کرے آپ پر ابوابراہیم! کاش آپ زندہ رہتے تو اپنی قسم کا کفارہ ادا فرماتے۔

کچھ تعجب نہیں کہ خواب سے متاثر ہو کر امام طحاوی اسی دن غالباً ماموں کی قبر پر پہنچے ہوں گے اور اب اسی قسم کے کفارہ کا دوبارہ ذکر انھوں نے قبر پر کیا ہوگا۔ میرے خیال میں بجائے تعریض کے اس کا مطلب یہی لینا چاہیے کہ اپنے ماموں کا امام شکریہ ادا کرتے تھے کہ آپ سے اس دن جھگڑے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شر سے ایک خیر پیدا ہو گیا۔ اگر آپ آج زندہ ہوتے اور میری علمی عظمت وشہرت اور میری فنی قابلیت ولیاقت کو دیکھتے تو خوشی سے آپ اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ قصہ پیش نہ آتا تو شاید امام طحاوی میں وہ کدنہ پیدا ہوتی جس نے ان کا بالآخر امامت کے مرتبہ پر پہنچا دیا۔

بہر حال یہ تو ایک نکتہ بعد الوقوع ہے، کہتے ہیں یوں بھی امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک گونہ عادت سی ہوگئی تھی کہ جب طلبہ کو درس دیتے ہوئے کسی پیچیدہ مسئلہ کے حل کو پیش کرتے جو خود ان کے ذاتی غور وفکر کا نتیجہ ہوتا تو بیان کرنے کے بعد عموماً اسی رحم اللہ کے فقرہ کو دہراتے۔ فوائد بہیہ اور جواہر مضیہ دونوں میں ہے کہ طحاوی کا عام دستور تھا کہ جب درس دیتے اور مشکل وپیچیدہ سوالات کا حل پیش کرتے تو اس وقت ان کی زبان پر بے ساختہ وہی فقرہ رحم کرے اللہ میرے ماموں پر اگر زندہ رہتے تو اپنی قسم کا کفارہ ادا کرتے۔

یہاں مدرسہ کا ایک دلچسپ لطیفہ قابل ذکر ہے وہی پرانی مثل ''شعر مرا بمدرسہ کہ برد'' کی ایک پر لطف مثال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ طحاوی کا یہ قول کہ ''میرے ماموں کو اپنی قسم کا کفارہ دینا پڑتا اگر زندہ رہتے'' اس پر مدرسہ کے مولویوں نے ایک اعتراض جوڑ دیا کہ امام مزنی نے تو ''واللہ ما جاء منک شئ'' کہا تھا۔ یعنی قسم میں صیغہ ماضی کا تھا اور واللہ بھی ایسے مواقع میں جب بغیر نیت کے

سبقت لسانی کے طور پر نکل جاتا ہے تو ایسی صورت میں طحاوی کا جو مذہب ہے یعنی حنفی فقہ کی رو سے کفارہ ہی کب واجب ہوتا ہے؟ غالباً کسی ملا نے شاہ عبدالعزیز صاحب پر یہ اعتراض کیا تھا۔ مدرسہ میں جب اعتراض اٹھ جائے تو بھلا اس کا جواب نہ دیا جائے بغیر اس کے لوگوں کی تسلی کیسے ہوسکتی ہے۔ بیچارے شاہ عبدالعزیز صاحب نے بستان المحدثین میں اس کا یہ جواب دیا تھا:

ایں حکم برمذہب مزنی است نہ بر مذہب طحاوی۔	کفارہ دلانے کا حکم مزنی کے مذہب کے مطابق ہے نہ کہ طحاوی کے مذہب کی بنیاد پر۔

یعنی شافعیوں کے مذہب میں چونکہ اس قسم کی قَسم جو بغیر قصد وارادہ کے ہو اس پر بھی کفارہ لازم آتا ہے تو مزنی کو اپنے مذہب کی رد سے کفارہ دینا ہی پڑتا اور یہ ہی طحاوی کی مراد تھی مگر مدرسہ کا یہ بھی قاعدہ ہے کہ جو اعتراض وہاں اٹھا پھر قال اقول کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ مولانا عبدالحئ فرنگی محلی نے اپنی کتاب ''الفوائدالبہیہ'' کے حاشیہ پر شاہ صاحب کے اس جواب پر پھر اعتراض کر دیا۔

قلت هذا إنما يصح إذا كان يمينه بلفظ لا جاء منك على لفظة الماضي كما في بعض الكتب وأما إذا كان يمينه بلفظة يجئ على الاستقبال فالكفارة واجبة فيه عندنا أيضا كما لا يخفى على ماهر الفقه.	میں کہتا ہوں کہ شاہ صاحب کا یہ جواب اس وقت صحیح ہوسکتا ہے اگر لا جاء منک میں ماضی کا صیغہ ہو جائے جیسا کہ بعض کتابوں میں ہے لیکن اگر مزنی کی قسم مضارع کے لفظ یجیئ کی شکل میں ہے یعنی مستقبل سے صیغہ کا تعلق ہے تو کفارہ ایسی صورت میں حنفی مذہب کے رو سے واجب ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک تاریخی مسئلہ ہے کوئی قرآن کی آیت بلکہ حدیث بھی نہیں ہے کہ مؤرخین بیچارے بجنسہٖ ان الفاظ کے نقل کے ذمہ دار ہوں جو مزنی نے کہتے تھے، میں نے کہیں نقل بھی کیا ہے کہ انھیں کتابوں میں ''لا أفلحت'' وغیرہ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ اس لیے اس پر بحث ہی غیر ضروری ہے ورنہ اگر سوال اٹھایا جائے تو بہت سے اٹھ سکتے ہیں مثلاً یہی کہ اگر کوئی قسم کھا کر

مرجائے اور واقعہ اس کی قسم کے خلاف ظہور پذیر ہو تو قسم کھانے والے کو گناہ ہوگا یا نہیں اگر وہ ذمہ دار ہے تو ورثہ کو ''اُودین'' کے تحت وجوبا یون ہی تبرعاً کفارہ ادا کرنا چاہیے یا نہیں مگر میری غرض صرف ایک دلچسپ لطیفہ کا ذکر ہے۔ بھلا تاریخی مباحث میں اگر ان سلسلوں کو چھیڑا جائے گا تو کیا ایک واقعہ بھی ختم ہوسکتا ہے؟ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے لیے اس دن کا یہ قصہ اسی ''امرأہ سواد'' کا ''یوم الحدیا'' ہوگیا جس کا ذکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ سے صحیح بخاری میں ہے اور جو ہر مجلس سے اٹھتے ہوئے:

ویوما الحدیا من تعاجیب ربنا إلا أنه من بلدة الكفر أنجاني.

چیل کا دن ہمارے رب کے عجیب دنوں میں تھا اسی دن میرے رب نے کفر کی آبادی سے نجات بخشی۔

پڑھا کرتی تھی۔①

① مختصر قصہ اس کا یہ ہے کہ ایک حبشن باندی کسی قبیلہ میں رہتی تھی۔ جس کی لونڈی تھی اس کے گھر کا ایک زیور غائب ہوگیا تھا۔ عام خیال لوگوں کا یہی ہوا کہ اس لونڈی کا کام ہے، مار دھاڑ ہوئی مگر وہ بالکل ناواقف تھی کہ عین اس حال میں کہ اس پر تشدد ہو رہا تھا فضا سے کوئی چیز گری۔ دیکھتے ہیں کہ وہ زیور ہے۔ سرخ چمڑے سے چونکہ مڑھا ہوا تھا چیل اچک کر لے بھاگی تھی، سمجھی کہ گوشت کا کوئی ٹکڑا ہے لیکن کام کا نہ پا کر اس نے چنگل سے چھوڑ دیا۔ لونڈی بیچاری کی جان بچ گئی۔
مگر اس ظلم کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ اس قبیلہ سے فرار ہو کر وہ مدینہ منورہ چلی آئی اور مسلمان ہو کر وہیں رہنے لگی، اپنے اسی واقعہ کو کبھی کبھی یاد کرتی تھی۔

⑥

اوراب میں امام امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ''یوم الحدیا'' کے ''تعاجیب ربنا'' کی کچھ تفصیل کرنا چاہتا ہوں میرا مطلب یہ ہے کہ اس واقعہ پر جو نتائج مرتب ہوئے اب ان کو نمبروار بیان کروں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ المزنی کی مختصر سے قاضی بکار کی جو ''کتاب جلیل'' پیدا ہو چکی تھی، سچ پوچھئے تو اس واقعہ کی بدولت امام طحاوی کی بکار کی کتاب کے از یر اثر اور زیر ہدایت ورہنمائی اس سے بہتر نقش پر اپنی مختصر ''صغیر'' و ''کبیر'' کے تیار کرنے کی توفیق ہوئی، نہ یہ واقعہ پیش آتا نہ طحاوی ماموں کو چھوڑتے نہ قاضی بکار ان پر مہربان ہوتے اور ان کی ہر طرح کی امداد کر کے اس قابل بناتے کہ وہ مختصر مزنی جیسی کتاب کے مقابلہ کی کتاب لکھ سکتے۔

مختصر المزنی کے متعلق ابن سریج کا جو خیال تھا اس کا ذکر آ چکا ہے۔ حاجی خلیفہ نے ''کشف الظنون'' میں اس پر اور اضافہ کیا ہے کہ علمائے شافعیہ نے مزنی کے بعد:

علی منواله رتبوا ولكلامه فسروا و شرحوا هم عاكفون عليه و دارسون له و مطالعون فيه دهرا.①

مختصر مزنی کے دھرے پر آئندہ اپنے فقہی مسائل کو مرتب کرتے رہے اور مزنی کی اسی کتاب کی تفسیر کرتے رہے، شرح لکھتے رہے، گویا اسی کے گرد الٹی پالٹی مارے جمے ہوئے ہیں درس اسی کا دیتے ہیں اور مطالعہ اسی کا ایک زمانہ دراز سے کر رہے ہیں۔

شافعیوں کی ایسی ٹھوس کتاب کے مقابلہ میں حنفیوں کی طرف سے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا اپنی مختصر پیش کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے اور معاملہ صرف اسی پر ختم نہیں ہو گیا، ان شروح وحواشی کے سوا جو اس وقت تک مختصر طحاوی پر علمائے احناف نے لکھے ہیں ان میں سے علاوہ عام مصنفین جیسے

① کشف الظنون، مختصر المزنی، ج:۲، ص:۵۲۴۔

احمد بن علی الوراق وغیرہ کے حنفیوں کے دو جلیل القدر فاضلوں یعنی صاحب ''احکام القرآن'' ابوبکر الجصاص المتوفی ۳۷۰ھ اور ان سے بھی بڑھ کر علی بن محمد الاسیجابی المتوفی ۴۵۴ھ ہیں، جن کا یہ فخر بھی کیا کم ہے کہ ان کے ایک شاگرد صاحب ہدایہ کی کتاب ''ہدایہ'' آج سات ساڑھے سات سو سال سے تمام مشرقی ممالک کے درس میں داخل ہے۔ کہتے ہیں کہ اسیجاب چینی ترکستان کا کوئی شہر ہے، گویا اسی دن کے واقعہ نے مصر اور چینی ترکستان جیسے دور دست علاقوں کا علمی ڈانڈا ملا دیا۔ اسیجابی کے متعلق طاش کبری زادہ نے لکھا ہے:

لم یکن بما وراء النهر في زمانه من یحفظ المذهب مثله.① — ماوراء النہر میں اسیجابی کے زمانہ میں کوئی آدمی ایسا نہیں تھا جسے مذہب (فقہی مسائل) اتنے زبانی یاد ہوں۔

طحاوی کی مختصر کے متعلق یہ کام تو خیر گھر میں علمائے احناف کرتے رہے لیکن اس سے زیادہ اس کا اثر شوافع پر پڑا، سب جانتے تھے کہ مختصر المزنی کے رد میں قاضی بکار نے جو ''کتاب جلیل'' لکھی تھی وہ اگرچہ مردہ ہوگئی لیکن طحاوی نے اپنے مختصر سے اسی کتاب کو زیادہ قوت دے کر زندہ کر دیا ہے کیونکہ بتا چکا ہوں کہ امام طحاوی نے اپنی اس کتاب کو کتب ابی حنیفہ یعنی امام محمد کی کتابوں سے الگ ہو کر مزنی کی ترتیب پر مرتب کیا ہے، یعنی مزنی کی مختصر کے ہر باب کے مقابلہ میں طحاوی نے بھی وہی باب قائم کیا ہے اور جہاں جہاں مزنی نے حنفی نقطہ خیال پر تنقید کی ہے، طحاوی نے پوری طاقت سے اس کا جواب دیا ہے اس لیے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ عام فنون کے برعکس وہ زیادہ تر اختلافی مسائل پر مشتمل ہے۔②

طحاوی کی یہ کتاب شوافع پر سخت گراں گذر رہی تھی لیکن کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ میدان میں

① مفتاح السعادۃ، ج:۲، ص:۱۳۸۔

② کشف الظنون، مختصر الطحاوی فی فروع الحنفیۃ، ج:۲، ص:۵۱۷۔

اترے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تو خیر امام ہیں لیکن مختصر طحاوی کا مقابلہ اگر کوئی کر سکتا تھا تو المزنی ہی کا قلم کر سکتا تھا، لیکن افسوس کہ حالات ایسے پیدا ہوئے کہ ان کی زندگی میں طحاوی اپنی کتاب مرتب نہ کر سکے۔

بہر حال اس کتاب کے بعد عام طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شافعیوں کا رنگ بہت پھیکا پڑتا چلا جاتا تھا، جس کا ثبوت میں ابھی پیش کروں گا، اس لیے ''شافعیت'' کے ہمدردوں میں بڑی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ان میں حدیث کے جاننے والے تو بہت تھے لیکن مزنی کی مختصر ہو یا طحاوی کی دونوں میں حدیث سے زیادہ فکری ونظری قوت سے کام لیا گیا تھا اور اس کے ساتھ حدیث کے لحاظ سے بھی کوئی گوشہ کمزور نہ تھا کیونکہ امام طحاوی بخلاف عام علمائے احناف کے دونوں کے مرد تھے، جس کا اعتراف جیسا کہ ذکر ہو چکا ان کے ایک حریف نے قاضی ابوعبداللہ کے بھرے اجلاس میں کیا تھا۔

جہاں تک میرا خیال ہے تقریباً سو سال تک مصر ہو یا بغداد، خراساں ہو یا حجاز حالانکہ ہر جگہ علمائے شافعیہ کی خاص تعداد پائی جاتی تھی، اور ان میں بڑے بڑے لوگ تھے لیکن مختصر الطحاوی کے مقابلہ میں کسی کا قلم نہ اٹھا۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ:

بالآخر چوتھی صدی کے وسط میں گویا طحاوی کی وفات سے تقریباً سوسوا سو سال بعد ایک عالم ابوبکر احمد بن الحسین بن علی خراسان کے مشہور شہر نیشاپور کے علاقہ بیہق میں پیدا ہوئے جو عام طور پر علمی دنیا میں البیہقی کے نام نامی سے مشہور ومعروف ہیں۔ سنہ ولادت ۳۸۴ھ اور وفات ۴۵۸ھ ہے۔

حافظ بیہقی میں بچپن ہی سے سعادت وہوشمندی کے آثار نمایاں تھے، ذہبی نے لکھا ہے کہ:

كتب الحديث و حفظه من صباه.① حدیث لکھی اور اس کو یاد کیا بچپن ہی سے۔

پھر قوت فہم اور حسن حافظہ میں نمایاں امتیاز رکھتے تھے، ان کو اپنے طلب علم کے سلسلہ میں جس کا دائرہ خراساں، عراق، حجاز، جبال سب کو محیط ہے اور تقریباً سو سے اوپر اساتذہ سے استفادہ کا موقعہ ملا۔ ایک تعلیمی خصوصیت ان کو یہ حاصل ہوئی کہ مشہور محدث جلیل صاحب ''مستدرک الحاکم'' سے علم حدیث اور شافعی مذہب کے ممتاز فقیہ ناصر بن محمد ابوالفتح المروزی سے فن فقہ کے سیکھنے کا کافی موقعہ ملا۔ گویا اس طرح سے حدیث اور فقہ دونوں کی جامعیت جیسا کہ طحاوی کے حال میں نقل کر چکا ہوں، کم علماء کو میسر آتی ہے مگر ان کو ہر ایک سے بہرۂ وافر ملا، حدیث کے متعلق صرف اتنا ہی کافی ہے کہ بالاتفاق تمام مؤرخین انکو حافظ الحدیث کے لقب کے ساتھ ساتھ:

من كبار أصحاب الحاكم أبي عبدالله ابن البيع في الحديث.② ابوعبداللہ ابن البیع یعنی الحاکم کے بڑے ممتاز تلامذہ میں ان کا شمار ہے یعنی حدیث میں۔

قرار دیتے ہیں، نیز ان دونوں علوم کے علاوہ مشہور شافعی متکلم واصولی علامہ ابن فورک جو خاص کر عبداللہ بن کرام رئیس فرقہ کرامیہ سے مناظرہ کے لیے غزنین سلطان محمود کے دربار میں بلائے گئے تھے اور بقول ابن خلکان سلطان کے سامنے:

جرت بها مناظرات. ابن کرام اور ابن فورک میں مناظروں کا سلسلہ جاری رہا۔

ان سے کافی طور پر انھوں نے استفادہ کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ لوگ ان کے استاد الحاکم کے مقابلہ

① تذکرۃ الحفاظ للذھبی، رقم الترجمۃ ۱۰۱۴ البیھقی، ج:۳، ص:۱۱۳۳۔

② مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان، سنۃ ثمان وخمسین واربع مائۃ، ج:۳، ص:۶۳ ووفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۲۸ ابوبکر البیھقی، ج:۱، ص:۴۶۔

میں لکھتے ہیں کہ:

والزائد عليه في أنواع العلوم.①	بیہقی کا مرتبہ بعض علوم میں استاد (حاکم) سے بڑھا ہوا ہے۔

ایک عجیب اتفاق یہ بھی تھا کہ ان کے استاد الحاکم اور ابن فورک دونوں کے دونوں اپنے زمانہ میں قلم کے بادشاہ تھے، حاکم کی تالیفات کے متعلق کہتے ہیں کہ:

صنف في علومه ما يبلغ ألفا وخمسمائة.②	ایک ہزار پانچ سو کے قریب ان کے تصانیف کی تعداد ہے۔

اور تقریباً یہی حال ابن فورک کا بھی ہے:

بلغت مصنفاته في أصول الفقه والدين ومعاني القرآن قريبا من مائة مصنف.③	اصول فقہ، اصول دین، معانی القرآن وغیرہ علوم میں ان کی تصنیفات کی تعداد سو کتابوں کے قریب پہنچتی ہے۔

الغرض کچھ ایسے مواقع علامہ بیہقی کو ملتے رہے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

جمع بين علم الحديث والفقه وبيان علل الحديث والجمع بين الأحاديث.④	علم حدیث وفقہ کے جامع بن گئے اور حدیث کے علل بیان کرتے اور مختلف حدیثوں میں تطبیق دینے میں ان کو کمال حاصل تھا۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ سب کچھ سیکھنے سکھانے، پڑھنے پڑھانے کے بعد بجائے اس کے کہ یہ اپنے علم سے کوئی دنیاوی سربلندی حاصل کرتے جیسا کہ اس زمانہ میں عام دستور تھا ابوالحسن بیہقی

① وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۲۸ ابوبکر البیھقی، ج:۱، ص:۷۶۔
② وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۶۱۵ الحاکم بن البیع النیسابوری، ج:۲، ص:۳۶۴۔
③ وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۶۱۰ ابوبکر ابن فورک، ج:۲، ص:۳۶۰۔
④ تذکرۃ الحفاظ للذھبی، رقم الترجمۃ ۱۰۱۴ البیھقی، ج:۳، ص:۱۱۳۳۔

گھوم گھما کر پھر اپنے گاؤں خسروجرد ہی میں آ کر گوشہ گیر ہو گئے، یہ خسروجرد دراصل نیشاپور کے پرگنہ بیہق کے بہت سے گاؤں میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ''بستان المحدثین'' میں لکھا ہے کہ:

بیهق نام چنددیه است متصل در بست کروے از نیشاپور که مجموع آن دیهات را بیهق گویند مثل بارا هریانه در نواح ①

بیہق چند گاؤں میں جو نیشاپور سے بیس کوس کے فاصلہ پر واقع ہیں ان چند دیہاتوں کو مجموعی طور پر بیہق اسی طریق سے کہتے ہیں جیسی دہلی کے اطراف بارا ہریانہ کے لفظ کا اطلاق چند دیہاتوں پر ہوتا ہے۔

الغرض علاقہ بیہق کے کسی مختصر سے گاؤں خسروجرد میں عزلت نشین ہو گئے اور وہیں نہایت سادہ فقیرانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ ذہبی نے عبدالغافر کی تاریخ نیشاپور سے نقل کیا ہے:

كان على سيرة العلماء قانعا باليسير متجملا في زهده وورعه.

علماء کی روش پر تھے یعنی تھوڑے پر بس کرنے والے اپنے زہد وتقویٰ کے ساتھ لپٹے ہوئے اور اس پر ڈٹے رہنے والوں میں تھے۔

غالباً خسروجرد ہی کے زمانہ کا یہ حال ہے جس کا ذکر الیافعی نے ''مراۃ'' میں کیا ہے کہ:

إن سرد الصوم ثلاثين سنة. ②

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے تیس سال تک مسلسل روزے رکھے ہیں۔

تحصیل کمال کے بعد اس طرح سے ایک دیہات کی طرف واپس لوٹنے جہاں ظاہر ہے کہ نہ طلبہ زیادہ تعداد میں مل سکتے ہیں اور نہ عقیدتمندوں کا جھمیلا ہوسکتا ہے اس قسم کی زندگی گذارنے کا خصوصاً بڑے بڑے مصنفین اساتذہ کی خدمت میں رہنے کے بعد لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ درس

① بستان المحدثین، ص:۴۹۔

② مرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان، سنۃ ثمان وخمسین واربع مائۃ، ج:۳، ص:۶۳۔

وتدریس تذکیر ووعظ قضاء افتاء وغیرہ سے زیادہ اپنی عافیت کی زندگی میں اکثر وبیشتر تالیف وتصنیف میں مشغول رہے۔ چونکہ خاندانی طور پر یہ شافعی تھے اوران کے جتنے بڑے اساتذہ ہیں وہ بھی شافعی المسلک ہی تھے خصوصا الحاکم کا شغف تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے اتنا بڑھا ہوا کہ ایک مستقل کتاب ہی فی ''فضائل الشافعی رحمۃ اللہ علیہ'' تصنیف کی تھی۔اس لیے قدرتی طور پران کوشافعی مکتب خیال ہی کے متعلق کتابوں کی تصنیف کرنے کا خیال پیدا ہوا۔میرا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں ان کی پہلی کتاب وہی ہے جس میں انھوں نے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نظریات و مجتہدات کو جواب تک مولفات بغدادیہ (اقوال قدیمہ) اورمولفات مصریہ (اقول جدیدہ) نیز تلامذہ کی مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے تھے اور تقریباً دوسوسال سے اسی منتشر اور پراگندہ حال میں پائے جاتے تھے جمع کیا ہے چیونٹیوں کے منہ سے شکر کا جمع کرنا آسان نہ تھا لیکن خدا نے امام بیہقی کو توفیق عطا فرمائی اورجیسا کہ ابن خلکان اور یافعی نے لکھا ہے:

هو أول① من جمع نصوص الشافعي في عشر مجلدات.②	پہلے آدمی بیہقی ہیں جنھوں نے دس جلدوں میں امام شافعی کے نصوص اور تصریحات کو جمع کیا ہے۔

ملک میں عام طور پران کی شہرت اورامام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت کا عام چرچا اگر ایسے اہم کام کے انجام دینے کے بعد ہونے لگا تو کیا تعجب ہے۔

سنین کے حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ بیہقی اپنے مختصر گاؤں میں تقریباً ۵۷ سال کی عمر تک مقیم رہے، ظاہر ہے کہ جن علمی کمالات اور غیر معمولی حفظ وذکاوت کے وہ مالک تھے پھر جن کثیر

① مگر تعجب ہے کہ ذہبی نے نصوص الشافعی کی کل تین جلد ہی بتائی ہیں۔

② وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ:۲۸ ابوبکر البیھقی، ج:۱،ص:۷۶ ومرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان، سنۃ ثمان وخمسین و اربع مائۃ، ج:۳،ص:۶۳۔

التالیف اساتذہ یعنی الحاکم اور ابن فورک کی صحبتوں میں انھوں نے زندگی گذاری تھی وہ ان کو نچلے اور بیکار بیٹھنے کیسے دیتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نصوص الشافعی کے بڑے کام سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے شافعی مذہب کے متعلق کسی اور خدمت کے انجام دینے کا ارادہ کیا۔ شاید کام شروع کر چکے تھے یا کرنے والے تھے کہ اسی عرصہ میں طبقہ شافعیہ کے بعض علماء کو ان کی اس غیر معمولی محنت کو دیکھ کر جو نصوص الشافعی کے مرتب کرنے میں اٹھائی تھی اور شافعیوں پر دوسو سال سے جو بات بطور قرض کے چڑھی آتی تھی اس کو اتارنا تھا، ان کو خیال گذرا کہ اسی قسم کا دوسرا قرض جو ہمارے طبقہ پر ایک مدت سے باقی چلا آ رہا ہے کیوں نہیں بیہقی ہی سے اس کے چکانے کی استدعا کی جائے۔

میری مراد امام طحاوی اور ان کی کتابیں خصوصاً مختصر کبیر و مختصر صغیر سے ہے جس میں المزنی کے مقابلہ میں حنفیہ کی جانب سے پورا زور دکھایا گیا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ طحاوی کی اور کتابیں بھی خواہ وہ کسی مقصد سے لکھی گئی ہوں، مثلاً ''معانی الآثار'' ہو یا ''مشکل الآثار'' اگر براہ راست نہیں تو بالواسطہ اس کی زد بھی شافعیت ہی پر پڑتی تھی اور ایسی زد تھی جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، سو سال تک کوئی اس کے مقابلہ کے لیے شافعیوں میں تیار نہ ہوسکا تھا، بہرحال یہ تجویز طے ہوئی کہ ابوالحسن بیہقی کو طحاوی کے مقابلہ میں کھڑا کیا جائے، کیونکہ طحاوی کے مقابلہ کے لیے جس جامعیت کی ضرورت تھی وہ ان میں پائی جاتی تھی افسوس ہے کہ اس شافعی عالم یا ان علماء کا خصوصیت سے تو مجھے پتہ نہ چل سکا لیکن یہ بات کہ طحاوی کے مقابلہ میں بیہقی کو باضابطہ تحریک کے ذریعہ سے آمادہ کیا گیا۔ اس کا ذکر تو خود علامہ بیہقی نے اپنی کتاب ''معرفۃ السنن والآثار'' میں کیا ہے۔ کتاب الطہارت بالماء کے باب سے پہلے وہ خود ارقام فرماتے ہیں:

"وحين شرعت في هذا الكتاب بعث إلى بعض أخواني من أهل العلم بالحديث

بكتاب أبي جعفر الطحاوي وشكا في ما كتبه إلى ما رأى فيه من تصنيف أخبار صحيحة عند الحفاظ حين خالفها رائه وتصحيح أخبار ضعيفة عندهم حين وافقها رائه وسالني أن أجيب عما أحتج به مما حكم.“①

”جب اس کتاب کو میں نے لکھنا شروع کیا تو اہل علم میں سے بعض بھائیوں نے ابوجعفر طحاوی کی کتاب بھیجی اور ان کی سخت شکایت کی یعنی طحاوی کی کتابوں میں ان کو جب یہ محسوس ہوا کہ حفاظ حدیث کے نزدیک جو خبریں صحیح ہیں اگر اس کی رائے سے یہ خبریں مخالف ہیں تو ان کو ضعیف قرار دیتا ہے اور حفاظ حدیث کے پاس جو حدیثیں کمزور ہیں ان کو قوی کر دیتا ہے اگر اس کی رائے کے موافق ہوتی ہیں۔ ان ہی اہل علم صاحب نے طحاوی کی اس شکایت کے بعد مجھ سے خواہش کی کہ طحاوی نے جن چیزوں سے استدلال کیا ہے اور جو فیصلے کیے ہیں ان کا جواب دوں۔“

نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تجویز کوئی شخصی رائے تھی یا کسی جماعت کی طرف سے بیہقی کے پاس پیش کی گئی تھی لیکن تجویز اور تجویز کے ساتھ خود ابوجعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کا بھیجنا یہ خود دلیل ہے کہ صرف کسی دوسری شکل میں بیہقی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ باضابطہ زور ڈالا گیا ہے کہ وہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیں اور اسی لیے پورے طور پر مسلح کر کے یعنی طحاوی کے اعتراضات کو بھی پیش نظر رکھنے پر آمادہ ہو گئے بلکہ اس کے بعد خود لکھتے ہیں کہ اس مہم کی سرانجامی سے اب تک ہر شافعی عالم جو ہچکچا رہا تھا، قبل اس کے کہ اس کے سر کرنے پر آمادہ ہو جاتا۔ معاملہ کی اہمیت کے مدنظر اپنے لیے غیبی قوت سے نئی امداد لینا بھی ضروری قرار دیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ بیہقی نے خود اپنے قول کے مطابق استخارہ کیا اور استخارہ کے بعد:

① معرفۃ السنن والآثار، باب: سبب تالیف کتاب معرفۃ السنن والآثار، ج:۱، ص:۲۱۷۔

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفان موج افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجریہا ومرسٰہا

اورسوسال سے جوقرض شافعیہ پرحنفیوں کا باقی چلا آ رہا تھا اس کے اتارنے کے لیے آستین چڑھالیں گو مجھے اس کا اب تک کوئی ثبوت نہیں ملا ہے لیکن غالب قرینہ ہے کہ اس سلسلہ میں مختلف جہات سے ان کے پاس کتابیں فراہم کی گئیں، آخر جب ابوجعفر طحاوی کی تالیفات ان کے مستعد ہونے سے پہلے ان کے پاس بھیجے گئے تھے تو آمادہ کرنے والوں نے آئندہ ہر قسم کی امداد سے دریغ کیوں کیا ہوگا، خصوصاً اگر اس واقعہ کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے کہ یہی وہ زمانہ ہے جس میں علمائے شافعیہ کے سب سے بڑے قدر شناس اور عقیدت مند نظام الملک طوسی اسی نیشاپور میں ملک شاہ سلجوقی کے مطلق العنان نائب السلطنت تھے جو علاوہ محط العلماء الشافعیہ ہونے کے خود بھی ایک بڑے عالم تھے، کبھی کبھی درس حدیث کا حلقہ اپنے ایام وزارت میں بھی قائم کیا۔ بلکہ اگر اسے بدگمانی نہ سمجھی جائے تو کہہ سکتا ہوں کہ حافظ بیہقی کو فکری ونظری امداد بھی باہر سے پہنچائی جاتی ہو تو کچھ تعجب نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اُدھر علامہ بیہقی نے طحاوی کے مقابلہ میں قلم اٹھایا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قبل اس کے کہ کتاب لکھ کر تیار ہو جائے۔ طبقہ شافعیہ میں اس کتاب کی دھوم مچی ہوئی ہے حتیٰ کہ بعض لوگوں نے تو تکمیل کتاب سے پہلے ہی شافعیوں کی حنفیوں پر فتح کے خواب دیکھنے شروع کیے یعنی صرف خیالی خواب نہیں جو شاید اس زمانہ کا ہر شافعی عالم تقریباً دیکھ ہی رہا ہوگا بلکہ واقعی خواب لوگوں کو نظر آنے لگے۔

خود حافظ بیہقی کا بیان ہے کہ ابھی کتاب پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ ان کے ایک شاگرد جن کا نام محمد بن احمد تھا انھوں نے علامہ بیہقی سے آکر ایک دن بیان کیا:

رائت الشافعي في النوم و بيده جزء من هذا — میں نے خواب میں امام شافعی کو دیکھا کہ ان کے

الكتاب وهو يقول قد كتبت اليوم من كتاب الفقيه أحمد سبعة أجزاء وقال قرئتها.

ہاتھ میں اس کتاب کا جزء ہے اور فرمارہے ہیں آج فقیہ احمد کی کتاب سے سات اجزاء میں نے نقل کیے اور میں نے اس کو خود پڑھا۔

یہ محمد بن احمد صاحب نے ایک ہی دفعہ نہیں بلکہ جب کچھ اور اجزا پورے ہوئے تو پھر اسی قسم کا خواب دیکھا کیونکہ اس خواب کے بعد آگے یہ الفاظ بھی ہیں:

وراه بعيد ذلك.

اسی قسم کے خواب انھوں نے بعد کو بھی دیکھے۔

محمد بن احمد صاحب کے متعلق تو ''أصدقهم لهجة'' کے ذریعہ سے خود ان کے استاد نے صفائی پیش کر دی ہے لیکن ان کے بعد ایک دوسرے شافعی بزرگ نے جیسا کہ ان سے بھی حافظ بیہقی ہی راوی ہیں اگر چہ ان کے نام کی صراحت نہیں کی گئی ہے اور نہ ''لہجہ'' کی توثیق کی گئی ہے، اسی قسم کا خواب دیکھا، چنانچہ فرماتے ہیں:

في صباح ذلك اليوم رأى فقيه آخر من أخواني الشافعي قاعدا في الجامع على سرير وهو يقول استفدت اليوم من كتاب الفقيه حديث كذا وكذا.

اسی دن کی صبح میں میرے بھائیوں (شاگردوں معتقدوں) میں سے ایک فقیہ نے دیکھا کہ امام شافعی جامع مسجد میں ایک تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں اور فرمارہے ہیں کہ الفقیہ (یعنی بیہقی) کی کتاب سے آج ہی میں نے فلاں فلاں حدیث کا علم حاصل کیا۔

ذہبی کے ''تذکرۃ الحفاظ'' میں ہے کہ بیہقی کے صاحبزادے اسماعیل جن کا لقب شیخ القضاۃ تھا فرماتے تھے کہ ان دونوں خوابوں کی اطلاع مجھے میرے والد نے دی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ شوافع نے اس خواب کو کیسے برداشت کرلیا جس میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق دعویٰ کیا گیا ہو کہ

اپنے مقلد کی کتاب سے امام نے خود استفادہ کیا، لیکن جب شوافع اس کو تسلیم کرتے ہیں تو ہمیں ان راویوں پر شک کرنے کا کیا اختیار ہے خصوصاً حب خود حافظ بیہقی یا ان کے صاحبزادے کی طرف ان کو منسوب کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی تردید کی تجویز پاس ہوئی اور علامہ بیہقی کو اس پر آمادہ کیا گیا۔ استخارہ وغیرہ کر کے وہ اس پر آمادہ ہوئے اور قبل اس کے کہ کتاب پوری ہو، شوافع کا بیان ہے کہ صرف عالم ناسوت اور شہادت ہی میں نہیں بلکہ دوسرے عالم میں بھی اس کا چرچا اس کی تکمیل سے پہلے بڑے زور وشور سے ہونے لگا حتیٰ کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تک کی روح اس سے استفادہ کے لیے حاضر ہوئی اور یہ سارا قصہ تو کتاب کی تکمیل سے پہلے کا ہے۔ اسے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جس دن یہ کتاب مہذب ومرتب ہو کر پوری کتاب کی شکل میں تیار ہوئی ہوگی اس وقت شافعی طبقات میں کیا دھوم مچی ہوگی۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ جب علامہ بیہقی اپنے گاؤں خسروجرد میں ''معرفۃ السنن'' کو لکھ کر فارغ ہوئے تو فوراً نیشاپور سے ان کے پاس پیغام بھیجا گیا کہ آپ اس کتاب کو لے کر خود نیشاپور تشریف لائیے یہ پیغام کن لوگوں کی طرف سے آیا تھا، ابن خلکان نے تو مجہول کے صیغہ میں ذکر کیا ہے کہ:

وطلب إلى نيشاپور لنشر العلم فأجاب وانتقل إليها.①	علم کی اشاعت کے لیے نیشاپور بلائے گئے دعوت قبول کی اور خسروجرد سے منتقل ہو کر نیشاپور آ گئے۔

لیکن ذہبی نے بلانے والوں کا ذکر ذرا زیادہ واضح لفظوں میں کیا ہے یعنی:

طلب منه الأئمة الانتقال من الناحية إلى نيشاپور لسماع الكتب.	نیشاپور کے آئمہ اور پیشواؤں نے استدعا کہ کہ دیہات (ناحیہ) سے منتقل ہو کر مرکزی شہر

① وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۱۲۸ ابوبکر البیھقی، ج: ۱، ص: ۴۶۔

① نیشاپور کتابوں کے سنانے کے لیے آ جائیں۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلانے والے عوام نہیں تھے بلکہ الائمہ تھے جس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ عام علماء بھی نہیں تھے کیونکہ اس زمانہ کی اصطلاح کی رو سے ''الائمہ'' تو علماء کے اسی طبقہ کو کہہ سکتے ہیں جو علماء کے طبقہ میں بھی سب سے زیادہ سربرآوردہ اور ممتاز ہوں، ابن خلکان نے ''لنشر العلم'' کا لفظ لکھ کر بات کو مجمل کر دیا، حالانکہ ذہبی نے بجائے اس کے لکھا ہے کہ بیہقی کو نیشاپور کے ائمہ نے بلایا تھا تا کہ اپنی کتابیں خود اپنی زبان سے لوگوں کو سنائیں۔

یہاں بظاہر یہ خیال گذر سکتا ہے کہ جو کتاب شوافع نے طحاوی کے توڑ پر بیہقی سے لکھوائی تھی یعنی ''معرفۃ السنن'' محض اس کے سنانے کا تو اس میں ذکر نہیں ہے لیکن خود ذہبی نے اس کے بعد جس واقعہ کا ذکر کیا ہے، اس سے یہ مسئلہ بھی صاف ہو جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب علامہ بیہقی نے نیشاپور کے ائمہ کے پیغام کو منظور فرما لیا اور پورے ۵۷ سال کی جو زندگی خسرو جرد کے گوشہ انزوا میں گذری تھی، کیونکہ ذہبی نے لکھا ہے کہ خسرو جرد سے نیشاپور بیہقی ''فی سنہ احدی واربعین (۴۴۱)'' میں آئے اور اس حساب سے ان کی عمر ۵۷ سال کی ہوتی ہے۔ بہرحال جب وہ نیشاپور پہنچ گئے تو چوتھی صدی کا یہ شہر جو ہر اعتبار سے قریب قریب بغداد اور فسطاط (مصر) کا ہمسر تھا۔ یہاں انہی ائمہ کی جانب سے یہ انتظام کیا گیا کہ ان کے لیے ایک مستقل مجلس مرتب کی گئی، یعنی باضابطہ ایک حلقہ قائم کیا گیا اور کن لوگوں کا حلقہ؟ کیا معمولی طالب علموں، یا عام شہریوں کا، خود ذہبی لکھتے ہیں کہ ائمہ اس مجلس میں حاضر ہوتے تھے، وہی ائمہ بطور مستفیدین کے اس حلقہ میں شریک تھے پھر اس حلقہ میں بیہقی کو کس چیز کے سنانے کا حکم دیا گیا۔ ابن خلکان نے نشر العلم کہہ کے بات پر پردہ ڈال دیا، لیکن ذہبی نے صاف کھل کر لکھا

① تذکرۃ الحفاظ للذھبی، رقم الترجمۃ ۱۰۱۴ البیھقی، ج:۳، ص:۱۱۳۳۔

ہے کہ:

أعدو له المجلس لسماع كتب المعرفة. امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کے لیے مجلس اس لیے مرتب کی گئی تا کہ ان کی کتاب ''معرفۃ السنن'' سنی جائے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ ''الائمہ'' کے اس گروہ میں صرف نیشاپور ہی کے شافعی علماء رہتے تھے، یا باہر سے بھی علماء اس کتاب کو سننے کے لیے تشریف لائے تھے جب اس کے سماع کے لیے اتنا انتظام کیا گیا تھا تو کیا تعجب ہے کہ باہر سے بھی لوگ آئے ہوں۔

''معرفۃ السنن'' و ''الآثار'' چار جلدوں میں ختم ہوتی ہے۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اتنی ضخیم کتاب کتنے دنوں میں ختم ہوئی ہوگی اور جب ختم ہوئی ہوگی تو علمائے شوافع جو حنفیوں کے قرض کے بوجھ سے سو سال بعد ہلکے ہوئے تھے ان کی روحانی مسرت اور خوشی کی کوئی انتہا ہو سکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جیسے کتاب کی تکمیل سے پہلے حافظ بیہقی کے تلامذہ نے گذشتہ بالا خواب دیکھے تھے کتاب کی تکمیل اور غالبًا اس مجلس ائمہ میں سماع کے بعد ایک ممتاز سربرآوردہ عالم محمد بن عبدالعزیز المروزی نے خواب دیکھا جسے وہ خود ان لفاظ میں بیان کرتے تھے:

''میں نے دیکھا کہ ایک تابوت آسمان کی طرف چڑھتا چلا جا رہا ہے اور اس پر نور تڑپ رہا ہے، تب میں نے کہا کہ یہ کیا ہے؟ کہنے والے نے جواب دیا کہ احمد بیہقی کے یہ تصانیف ہیں۔''

علامہ بیہقی کے صاحبزادے اسماعیل بیہقی پہلے تو ان خوابوں کو اپنے والد ابوبکر احمد بیہقی کے حوالہ سے بیان کرتے تھے، ذہبی نے لکھا ہے کہ پھر فرمانے لگے:

سمعت الحكايات الثلث من الثلاثة المذكورين. میں نے ان تینوں قصوں کو خود ان تینوں خواب دیکھنے والوں سے بھی سنا ہے۔

اور یہ تو اس کتاب کی شہرت عالم بالا میں تھی، رہی اس پست دنیا میں اس کی کیا قدر ہوئی اور علمائے شافعیہ پر اس کتاب کا کیا اثر پڑا، اس کا اندازہ اسی ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ چوتھی صدی میں

شافعیوں میں جس گرامی ہستی پر بقول ابن خلکان اصحاب شافعی کی ریاست ختم تھی اور جن کے سپرد منبر ومحراب، خطابت وتدریس اور وعظ کی مجالس تھیں اور جن کو مشہور شافعی استاد مطلق ابواسحاق شیرازی اس طرح خطاب کرتے تھے:

یا مفید المشرق والمغرب أنت الیوم إمام الأئمة.	اے مشرق ومغرب کو فائدہ پہنچانے والے آج سارے جہان کے اماموں کے تم امام ہو۔

اور جن کی وفات پر کہا جاتا ہے کہ تمام بازار بند کر دیئے گئے تھے اور ان کا جو منبر جامع مسجد میں تھا وہ توڑ دیا گیا تھا اور طلباء نے اپنی دواتیں اور قلم توڑ ڈالے تھے کامل ایک سال تک حالت یہی رہی۔

میری مراد ''امام الحرمین'' سے ہے شاید ہی کوئی کتاب علماء اور علم کی تاریخ میں شوافع نے لکھی ہو جس میں بیہقی اور ان کے کارنامے کے متعلق ''امام الحرمین'' کا یہ فقرہ نہ نقل کیا جاتا ہو کہ وہ فرمایا کرتے تھے:

ما من شافعي المذهب إلا للشافعي علیه منة إلا أحمد البیهقي فإن له علی الشافعي منة.①	ایسا کون شافعی المذہب میں ہے جس پر امام شافعی کا احسان نہ ہو مگر صرف احمد بیہقی کہ ان ہی کا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پر احسان ہے۔

لوگ امام الحرمین کے اس فقرہ کو پڑھتے ہیں اور گذر جاتے ہیں لیکن سچ پوچھئے تو ان چند الفاظ میں امام الحرمین نے اس تاریخ کو بیان کر دیا ہے جسے خدا جانے کتنے اوراق میں بیان کرنے کی میں نے کوشش کی ہے اور اب بھی مطمئن نہیں کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ پورے طور پر کہہ سکا یا نہیں۔ گو اس کی کوئی صحیح سند مجھے اب تک نہیں ملی ہے کہ واقعی امام الحرمین نے ایسا ارشاد فرمایا تھا

① وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۱۲۸ ابوبکر البیھقی، ج:۱، ص:۴۶ ومرآۃ الجنان وعبرۃ الیقظان، سنۃ ثمان وخمسین واربع مائۃ، ج:۳، ص:۶۳۔

یا محض خوش اعتقاد شافعیوں نے اس فقرہ کو ان کی طرف منسوب کر کے اسے اچھالنے کی کوشش کی ہے۔

لیکن اس فقرہ کی معنویت خود دلیل ہے کہ کسی عمیق النظر، ژرف نگاہ مفکر کا یہ قول ہے جس کی نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ شافعی علماء سب کچھ کرتے رہے لیکن اگر طحاوی کے حملوں کا صحیح جواب ان کی طرف سے نہیں دیا گیا تو ایک دن دنیا سے شافعیت کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہی مطلب ہے امام الحرمین کا اپنے اس فقرہ سے کہ:

إلا أحمد البيهقي فإنه له على الشافعي منة. — مگر احمد بیہقی کہ ان کا امام شافعی ہی پر احسان ہے۔

میں نے جو کہیں یہ دعویٰ کیا تھا کہ طحاوی کی کتابوں سے شافعیت کا رنگ پھیکا پڑتا چلا جا رہا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ اس کا ثبوت آگے آ رہا ہے۔ میرا اشارہ اسی طرف تھا اس کی گواہی میں شافعیوں کے امام الائمہ اور مفید المشرق والمغرب، صاحب المنبر والمحراب امام الحرمین کو ہی پیش کرنا چاہتا تھا، اگر امام الحرمین کے کلام کا یہ مطلب نہیں ہے تو بتایا جائے کہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے طحاوی کے رد کے سوا امام شافعی پر اور کون سا بڑا احسان کیا۔ یہ بات کہ انھوں نے فقہ شافعیہ کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی ہیں یہ ان کی کوئی خصوصیت نہیں ہے خود ان کے استاد الحاکم ہی کا کام ان سے زیادہ ہے۔ شافعیوں کے البازالاشہب ابن سریج ہی کی تصنیفات کی تعداد چار سو بتائی جاتی ہے۔ آخر اگر بیہقی کا اصل کارنامہ طحاوی کے مقابلہ میں شافعی مذہب و مسلک کی تائید نہیں ہے تو پھر تمام شوافع ان کو:

كان من أكثر الناس نصرا لمذهب الشافعي.① — بیہقی امام شافعی کے مذہب کے سب سے زیادہ اور سب سے بڑے مددگاروں میں ہیں۔

① وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۱۲۸ ابوبکر البیہقی، ج:۱، ص:۴۶۔

کیوں کہتے ہیں، واقعہ یہی ہے کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے شافعیت پر جو لاجواب بے پناہ حملے کیے تھے اگر بیہقی ان کے مقابلہ میں نہ کھڑے ہو جاتے تو خدا ہی جانتا ہے کہ شافعیت کا دنیا میں کیا حشر ہوتا، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ''بستان المحدثین'' میں امام الحرمین کے مذکورہ بالا فقرہ کو نقل فرمانے کے بعد بالکل بجا طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ:

''بتائید و نصرت او (بیهقی) رواج این مذهب (شافعیت) دو بالا گشته.''①

بہر حال اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ ابوبکر احمد البیہقی نے مسلک شافعی کی بقا و ترویج میں بڑا انقلابی کام کیا، اوروں کو ان کے کام سے اطمینان ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن شافعیوں کا جو طبقہ طحاوی کے اعتراضات اور تنقیح کی وجہ سے دل گرفتہ ہو رہا تھا اگر اس طبقہ کی تسلی ان کی کتابوں سے ہو گئی اور جب وہ کہتے ہیں کہ ہو گئی تو پھر ان کی خدمات کی نہ قدر کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

نیشاپور کے ائمہ کی مجلس نے خود بیہقی کے حلقہ میں شریک ہو کر جب ان کا حوصلہ بڑھایا اور اسی نیشاپور کے امام الائمہ، نظام الملک طوسی کے سب سے زیادہ چہیتے ② اور معظم و محترم عالم امام الحرمین نے اپنے مذکورہ تاریخ فقرہ سے ان کو امام شافعی کا محسن قرار دے کر گویا پوری دنیا نے شافعیت کا محسن اعظم قرار دیا۔ قدرتی طور پر اس کا یہی نتیجہ ہونا چاہیے کہ اس سلسلہ میں حافظ بیہقی کی سعی و محنت کی رفتار اور تیز ہو جائے۔ انھوں نے ''معرفۃ السنن'' کے بعد پھر ٹھیک ''مختصر الطحاوی'' کے ''کبیر'' و ''صغیر'' کے مقابلہ میں دو سنن کبیر و صغیر لکھیں اور جس طرح امام طحاوی کی مختصر کی خصوصیت یہ تھی جسے نقل کر چکا ہوں: ''رتبہ علی ترتیب المزنی'' ٹھیک بیہقی نے بھی اپنی اس

---

① بستان المحدثین، ص: ۵۰۔

② تاریخوں میں لکھا ہے کہ اسلامی دور کے اس سب سے بڑے وزیر کا حال یہ تھا کہ جس وقت امام الحرمین ملنے تشریف لاتے، (بالغ فی اکرامہ واجلسہ فی مسندہ) ان کی تعظیم میں مبالغہ سے کام لیتے اور اپنی مسند خاص پر انہیں جگہ دیتے۔ (وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ: ۷۹۱ الوزیر نظام الملک، ج: ۱، ص: ۲۵۵)

صغیر و کبیر کو جیسا کہ حاجی خلیفہ لکھتے ہیں:

السنن الكبيرة والصغيرة كتابان لأبي بكر أحمد بن الحسين بن علي البيهقي وهما على ترتيب مختصر المزني. ①

سنن کبیرہ اور سنن صغیرہ یہ دونوں کتابیں ابوبکر احمد بن الحسین بن علی بیہقی کی ہیں۔ مزنی کی مختصر کی جو ترتیب ہے وہی ترتیب بیہقی کی ان دونوں کتابوں کی ہے۔

اس موقعہ پر ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ شوافع نے بیہقی کی کتابوں کی جتنی قدر کی جتنا اسے دنیا میں روشناس کرانے کی کوشش کی، ان کی کتابوں کی تعریف میں کبھی:

ما صنف في علم الحديث مثله تهذيبا وترتيبا وجودة.

علم حدیث میں ان کی کتاب اپنی ترتیب وتہذیب اور استواری وجودت کی خوبیوں کے لحاظ سے ایسی کتاب ہے کہ کہا جا سکتا ہے ایسی کوئی کتاب علم حدیث میں اب تک نہیں لکھی گئی۔

جیسا کہ سبکی نے لکھا ہے یا ذہبی نے:

عمل (البيهقي) كتبا لم يسبق مثلها.

بیہقی نے ایسی کتابیں تصنیف کیں کہ ان کتابوں سے پہلے ان کی مثال نہیں ہے۔

جیسا کہ آگے معلوم ہوگا بعض شافعیوں نے قسم تک کھائی ہے کہ فقہ شافعی میں کوئی صحیح درک پیدا ہی نہیں کر سکتا جب تک بیہقی کی ''معرفت'' نہ پڑھے۔ الغرض خود بیہقی کے معاصرین جب میں امام الحرمین بھی ہیں اور ان کے بعد ہر ملک اور ہر طبقہ کے شوافع بیہقی اور ان کی کتابوں کی تعریف میں رطب اللسان رہے اور ہیں، حتیٰ کہ حاجی خلیفہ جو حنفی ہیں ان کے قلم سے ان ہی تعریفوں سے

① کشف الظنون، السنن الکبیر والصغیر، ج:۲، ص:۴۸۔

متاثر ہوکر یہ جملہ سنن صغیر وکبیر کے متعلق بے ساختہ نکل گیا کہ:

لم يصنف في الإسلام مثلهما. (صرف مذہب شافعی کے لحاظ سے نہیں بلکہ) اسلام میں ان دونوں کتابوں جیسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔

اسی کا نتیجہ ہے جیسا کہ الیافعی نے لکھا ہے:

للبيهقي تصانيف كثيرة بلغت ألف جزء نفع الله تعالى بها المسلمين شرقا وغربا وعربا وعجما. بیہقی کی بہت سے تصنیفیں ہیں جن کی ضخامت ایک ہزار جزء تک پہنچتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شرق وغرب، عرب وعجم کے مسلمانوں کو ان کتابوں سے نفع پہنچایا۔

اور ہماری حکومت آصفیہ نے باوجود حنفی المسلک ہونے کے امام بیہقی کی سب سے بڑی کتاب ''السنن الکبیر'' جو ان کے علم کی انسائیکلو پیڈیا ہے دس ضخیم جلدوں میں حال میں شائع کی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ جس کے مقابلہ میں یہ ساری ہنگامہ آرائیاں ہوئیں یعنی امام طحاوی ان کی غیر تو غیر خود حنفیوں نے بھی جیسی کہ چاہیے قدر نہ کی، حد یہ ہے کہ اس وقت تک ان کی مختصر کبیر تو خیر، صغیر بھی طبع نہ ہوسکی۔ مدت ہوئی کی صرف ایک کتاب ''معانی الآثار'' بغیر کسی تصحیح اور اہتمام کے ہندوستان سے لیتھو میں شائع ہوئی اور نہایت نامکمل ناقص، غلط مسخ شکل میں چند سال ہوئے کہ ''مشکل الآثار'' کی کچھ جلدیں مطبع دائرۃ المعارف نے شائع کی ہیں جو مطبع کا قصور نہیں بلکہ علمائے احناف کی اس بے توجہی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان جیسے قدیم اسلامی بلکہ حنفی ملک اور مسلمانوں کی عظیم ترین آبادی میں اس کا بجز ایک ناقص غلط نسخہ کے اس وقت تک کوئی کام صحیح نسخہ نہ مل سکا تھا، خدا کرے اس کتاب کی تکمیل اور امام کی دوسری زرین کتاب کی اشاعت کی توفیق مسلمانوں کو عموماً اور دائرۃ المعارف کو خصوصاً میسر ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اپنے گاؤں خسرو جرد سے نیشاپور بلائے جانے کے بعد جہاں تک میرا خیال ہے حافظ بیہقی کا مستقل مستقر نیشاپور ہی رہا۔ سترہ سال تک وہ اسی شہر میں درس وتدریس، املا وتحدیث کے ساتھ اپنے مشن (نصرت مذہب الشافعی) میں پورے انہماک کے ساتھ مشغول رہے اور چوہتر سال کی عمر پاکر ۴۵۸ھ میں پانچویں صدی کے وسط میں نیشاپور ہی میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ جیسا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے کہ حافظ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی لاش کو تابوت میں رکھ کر بیہق لائے اور خسرو جرد میں دفن کیا۔①

اور اس میں شبہ نہیں کہ کیفیتاً کچھ ہی کہا جائے لیکن کماً اور مقدار وضخامت کے حساب سے بیہقی کے قلمی کارنامے امام طحاوی کی خدمتوں سے بہت زیادہ ہیں۔ گذر چکا ہے کہ لوگوں نے بیہقی کے تالیفات کے متعلق اندازہ کیا ہے کہ ہزار جزء سے زیادہ ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ باوجود اتنے بڑے جلیل محدث ہونے کے لوگ لکھتے ہیں کہ:

لم يكن عنده سنن النسائي ولا جامع الترمذي ولا سنن ابن ماجة.②	ان کے پاس نہ نسائی کی سنن تھی اور نہ جامع ترمذی اور نہ ابن ماجہ کی سنن تھی۔

حالانکہ امام طحاوی کے متعلق تو لوگوں کا خیال ہے کہ براہ راست نسائی سے بھی وہ روایت کرتے تھے تعجب ہے کہ یہ کتابیں ان تک کیسے نہیں پہنچیں اور یہ ایک اہم مسئلہ ہے جس پر بحث کرنے کی ضرورت ہے، اگر یہ واقعہ ہے تو پھر حافظ بیہقی کی علمی منزلت اور بلند ہوجاتی ہے کہ امام طحاوی سے وسائل بلکہ عمر کی کمی کے باوجود جیسا کہ چاہیے مقابلہ کا حق ادا کردیا، اگرچہ کہا جاسکتا ہے کہ گو امام طحاوی کی عمر ۸۳ سال کے قریب ہوئی لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصہ پریشانیوں میں گذرا۔ لکھنے لکھانے کا وقت نسبتاً ان کو کم ملا، بخلاف بیہقی کے وہ تو شروع ہی سے لکھنے میں مشغول ہوگئے،

① بستان المحدثین، ص:۵۰۔

② تذکرۃ الحفاظ للذھبی، رقم الترجمۃ ۱۰۱۴ البیھقی، ج:۳، ص:۱۱۳۳۔

یہاں محدثین کا ایک لطیفہ یاد آیا۔ مشہور محدث ابوعمر ابن الصالح نے ایک بات لکھی ہے کہ:

سمعت شيوخنا يقولون طول العمر دليل للرجل باشتغاله بأحاديث رسول الله صلى الله عليه وسلم.	اپنے استادوں سے میں نے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ درازی عمر اس بات کی دلیل ہے کہ اس شخص کی زندگی رسول اللہ ﷺ کی حدیث کی خدمت میں بسر ہوئی ہے۔

اور یہ تو شیوخ سے انھوں نے سنا تھا، آگے اپنا ذاتی تجربہ بھی بیان کرتے ہیں۔

ويصدقه التجربة فإن أهل الحديث إذا تتبعت أعمارهم تجدها في غاية الطول.①	تجربہ سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے تم علم حدیث کے خادموں کے حالات کا تتبع کرو تو پاؤ گے کہ انھوں نے عموماً انتہائی طویل عمر پائی ہیں۔

میری غرض اس لطیفہ کے نقل کرنے سے یہ نہیں ہے کہ میں امام طحاوی کے طول عمر کو حافظ بیہقی کی عمر کے مقابلہ میں اشتغال بالحدیث کی زیادتی کی دلیل بنانا چاہتا ہوں، کیونکہ ظاہر ہے کہ اس قسم کی چیزوں کو کلیہ نہیں قرار دیا جاسکتا لیکن ابن الصلاح کے جن شیوخ کا ''طول العمر دلیل للرجل اشتغالہ بالحدیث'' دعویٰ تھا ان کے دعویٰ کی بنیاد پر کوئی حنفی اگر اس راہ سے بھی طحاوی کی حدیث دانی کو بیہقی کی حدیث دانی پر ترجیح دے تو شاید الزامی حجت بننے کی اس میں صلاحیت ہو۔

خیر یہ تو ایک لطیفہ تھا، کہنا یہ ہے کہ اس اہتمام وانتظام کے ساتھ پانچویں صدی کے وسط بلکہ تقریباً آخر میں حنفیت پر شافعیت کی طرف سے یہ جوابی حملہ ایک ایسے وقت میں ہوا کہ جس فن کی راہ سے یہ حملہ کیا گیا اور اس علمی مقابلہ میں جو ہتھیار استعمال کیا گیا تھا، بیچارے احناف کم از کم اس زمانہ تک پہنچتے پہنچتے اگر اس ہتھیار سے بالکل بیگانہ نہیں تو بہت کچھ نامانوس ہو چکے تھے۔ چونکہ

① کشف الظنون، علم الحدیث، ج:۱، ص:۴۹۹۔

خلافیات میں فیصلہ کا یہ طریقہ کہ سنداً جو روایت سب سے زیادہ قوی ہو آنکھ بند کر کے اس کو ترجیح دے دینی چاہیے، یہ بالکلیہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ابتداعی نظریہ تھا اور اس کے لیے متن حدیث سے زیادہ ان رجسٹروں کے متعلق ماہرانہ بصیرت حاصل کرنے کی ضرورت ہے، جنہیں فن رجال کے ائمہ نے رواۃ حدیث کے متعلق مختلف اوقات میں مرتب فرمایا ہے، حنفیوں میں ترجیح کا یہ طریقہ شروع ہی سے ناپسندیدہ تھا۔ اس لیے ان کو حدیث کے اس خاص شعبہ سے پہلے بھی چنداں تعلق نہ تھا اور جیسے جیسے دین وعلم سے زیادہ دنیا طلبی لوگوں میں بڑھی اور بھی اس سے بیگانگی بڑھتی ہی چلی گئی۔ عموماً فقہ اصول فقہ (جو حکومت کا قانون تھا) اور ان ہی میں زیادہ مہارت حاصل کرنے کے لیے ذہنی اور ادبی علوم کی طرف لوگوں کا عام رجحان بڑھتا چلا جاتا تھا۔ طاش کبری زادہ جو دسویں صدی کے عالم ہیں انھوں نے اپنی کتاب ''مفتاح السعادۃ'' میں اگرچہ اپنے عہد کے علمائے احناف کا یہ حال لکھا ہے کہ:

إن قصارى نظر أبناء هذا الزمان في علم الحديث النظر في مشارق الأنوار للصاغاني، فإن ترفعت إلى مصابيح البغوي خلت أنها تصل إلى درجة المحدثين وما ذلك الا لجهلم بالحديث بل لو حفظها عن ظهر قلب وضم إيها ما من المتون مثليهما لم يكن محدثا حتى يلج الجمل في سم الخياط.①

ہمارے زمانے کے لوگوں کی انتہائی پرواز علم حدیث میں آج کل مشارق الانوار صغانی پر ختم ہوتی ہے اور اگر کہیں اونچے ہو کر تم بغوی کے مصابیح تک پہنچ گئے تو باور کرنے لگو گے کہ محدثین کے درجہ تک تم پہنچ گئے اور یہ نتیجہ ہے علم حدیث سے جاہل ہونے کا۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی اگر ان دونوں کتابوں کو اگر زبانی بھی یاد کر لے جب بھی وہ محدث نہیں ہوسکتا جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ سے نہ گذرے۔

① مفتاح السعادۃ، ج:۲، ص:۳

اور یہ حنفی مدارس اور حلقہ ہائے درس میں حدیث کا عام نصاب تھا۔ باقی اگر اس فن میں مہارت خصوصی کوئی حاصل کرنا چاہتا تھا تو طاش کبری زادہ جیسے محتاط بزرگ کے قلم سے یہ الفاظ نکلتے ہیں۔

وإنما للذي يعده أهل هذا الزمان بالغا إلى النهاية وينادونه محدث المحدثين وبخاري العصر من اشتغل بجامع الأصول لابن الأثير مع حفظ علوم الحديث كمختصر ابن الصلاح أو التقريب والتيسير للنووي ونحو ذلك.	اور اس زمانہ میں فن حدیث کی انتہائی چوٹی تک پہنچنے والا آدمی جسے محدث المحدثین اور بخاری العصر کا خطاب دیا جائے وہ ہے جو ابن کثیر کے جامع الاصول کے ساتھ اشتغال رکھتا ہو اور اس کے ساتھ علوم الحدیث جن فنون کا نام ہے ان کے مختصرات مثلاً ابن الصلاح یا تقریب یا نووی کی تیسیر یا ان ہی جیسی کتابوں کا عالم ہو۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا، یہ رپورٹ یقیناً دسویں صدی ہجری کی ہے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ہم جس زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں تقریباً یہ حادثہ حنفی اسکولوں پر اسی زمانہ میں پیش آ چکا تھا ہمیں طاش کبری زادہ کے متعلق اس کو بھی اپنے سامنے رکھ لینا چاہیے کہ زمانہ ان کا خواہ کچھ ہی ہو لیکن جس مکان اور مقام میں بیٹھے ہوئے یہ الفاظ ان کے قلم پر آئے ہیں وہ مسلمانوں کی سیاسی قوت کا اس زمانہ میں آخری نقطہ کمال تھا۔ میری مراد قسطنطنیہ سے ہے، جہاں ترکوں کے اقبال کا آفتاب بڑے آب وتاب سے چمک رہا تھا، اس لیے حنفی علماء کی برگزیدہ ترین جماعت کا اس زمانہ میں اس کو مرکز ہونا چاہیے، گویا یہ حال اس طبقہ کے چوٹی کے افراد کا تھا اور یہ کیفیت صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔

اندازہ یا جا سکتا ہے کہ بیچارے حنفیوں میں بیہقی کی ان کتابوں سے کیسی کھلبلی مچی ہوگی، اپنی سیاسی قوتوں کے زور سے خواہ اس کمزوری کی تلافی کرتے ہوں، لیکن علم کے حلقہ میں جس قسم کی خفت

پانچویں اور چھٹی صدی کے تاج الشریعت اور شموس الائمہ، صدر الملۃ والدین ① لوگوں کو اٹھانی پڑتی ہوگی، سچی بات یہ ہے کہ اب بھی اس کے تصور سے طبیعت جھینپ جاتی ہے۔

ایک طرف شافعیوں کی جانب سے بیہقی کی کتابوں کے متعلق جو طحاوی کے توڑ پر لکھی گئی تھیں جیسا کہ السبکی سے شاہ عبدالعزیز صاحب نے نقل فرمایا ہے کہ:

''من قسم می خورم بر آن کہ این پنج کتاب را در عالم نظیرے نیست۔'' ②

ان حلفی الفاظ میں گویا "فهذا براهيني فجئني بمثلها" کا چیلنج پر چیلنج دیا جارہا تھا لیکن بیچارے احناف جو بیہقی کی گرفتوں کا اگر کچھ جواب دے سکتے تھے تو وہ ''کید بستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' کے نام سے بدنام تھا اور جس راستہ سے حریف جواب طلب کرتا تھا اس کے چلنے والے احناف میں یا بالکلیہ نہیں تھے یا کچھ تھے بھی تو وہ برائے نام۔ آخر ''مشارق الانوار'' اور ''مصابیح'' کی مقطوع السند حدیثوں کے پڑھنے والوں سے بھلا رجالی بحثوں اور ابن قطان، یحییٰ بن معین، علی بن مدینی، احمد بن حنبل جیسے ائمہ کی ناقدانہ راؤں کی کیا توقع کی جاسکتی تھی۔ بقول طاش کبری زادہ اس کے لیے تو ضرورت تھی ایسے آدمیوں کی جو:

عرف الأسانيد والعلل وأسماء الرجال	سندوں کے حالات سے واقف ہو، ان کے علل
والعالي والنازل وحفظ مع ذلك جملة	جانتا ہو، اسماء الرجال اور سند کی عالی ونازل
مستكثرة من المتون..... ويسمع ما	قسموں کے سمجھانے میں مہارت ہو، اس کے

① اس ''الملۃ والدین'' کی مٹی پچھلی صدیوں میں جتنی پلید ہوئی ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے الیافعی مراۃ الجنان میں لکھتے ہیں، "ثم عموا التلقيب بالدين فيما بعد حتىٰ السوقة و الفجرة لقبوهم بنور الدين و شمس الدين و زين الدين و كمال الدين و اشباه ذلك، ممن هم ظلام الدين و شين الدين و نقص الدين و اشباه ذلك من اضداد الدين" آخر میں ایک بزرگ ابن عجیل کے قول پر بدتمیزی کے اس طوفان کو ختم کرتے ہیں، "هذه الالقاب فلم اجد منها صادقا الا صارم الدين يعنى قاطع الدين"۔ (مراۃ الجنان، سنہ خمس وثمانین واربع مائۃ)

② بستان المحدثین، ص: ۵۰۔

ذكرناها وكتب الطبقات وزاد على الشيوخ وتكلم في العلل والوفيات والأسانيد كان في أول درجات المحدثين.①

ساتھ معتد بہ معقول سرمایہ متون کا اسے محفوظ ہو، اوران چیزوں کے ساتھ جس کا میں نے ذکر کیا طبقات کی کتابوں کا بھی اس نے مطالعہ کیا ہو، شیوخ اور اساتذہ جتنے بڑھا سکتا ہو ان کو بڑھایا ہو، اور علل وفیات اسانید کے متعلق خود اس نے گفتگو کی ہو، تب جا کر محدثین کے ابتدائی درجہ پر پہنچ سکتا ہے۔

اول درجات سے ظاہر ہے کہ اردو کا اول درجہ نہیں، بلکہ طبقہ محدثین کے ابتدائی درجہ میں ایسا آدمی شمار ہوسکتا ہے اور یہ چیزیں تو بقول شخصے حافظ بیہقی کے گھر کی چیزیں تھیں۔ان کی ساری عمران ہی چیزوں کی تلاش وتفتیش حفظ وتنقیح میں گذری تھی مگران کے سوافقہی وجدلی پایہ بھی انکا کچھ کمزور نہ تھا۔ابن فورک اور مروزی ان کے اساتذہ اصول وفقہ، معمولی درجہ کے لوگ نہ تھے۔

سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ احناف پر بیہقی کی کتابوں کا ایسا رعب چھایا کہ شوافع تو خیر حافظ بیہقی کے علمبردار ہی تھے۔خود حنفیوں کے زبان وقلم پر بھ ہم ان کی کتابوں کے متعلق وہی ستائش ومدح کے الفاظ پاتے ہیں کہ جواب تک صرف شافعیوں سے سنتے تھے۔حاجی خلیفہ کے الفاظ تو میں نقل ہی کر چکا ہوں، طاش کبری زادہ جیسے متبحر فاضل بھی بیہقی کے متعلق اس جامعیت کے اعتراف پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں، ''مفتاح السعادۃ'' میں فرماتے ہیں:

أبو بكر أحمد بن الحسين البيهقي كان أوحد دهره في الحديث والتصانيف ومعرفة الفقه.②

ابوبکر احمد بن البیہقی اپنے وقت کے یگانہ روزگار شخص حدیث کے فن اور اپنے تصانیف نیز فقہ کے علم کے لحاظ سے تھے۔

①،②مفتاح السعادۃ، ج:۲،ص:۳و۱۵۔

''فی الحدیث والتصانیف'' تک تو خیر غنیمت تھا، آگے ایک حنفی عالم کا ''الفقہ'' کے متعلق بھی بیہقی کو ''أوحد دہرہ'' کہنا کوئی معمولی بات نہیں ہے اور کمال یہ ہے کہ ''الفقہ'' میں جہاں انھوں نے البیہقی کو ''أوحد دہرہ'' قرار دیا ہے وہیں الحدیث کے سلسلہ میں بیچارے امام طحاوی کا ''احقر زمانہ'' کی حیثیت سے بھی تذکرہ نہیں کیا، حالانکہ محدثین کی فہرست میں امام بخاری اور مسلم کے ساتھ محی الدین النووی الحسین البغوی ابن الاثیر الجزری بلکہ بخاری کے شارحین میں سے ابن حجر ہی نہیں، الکرمانی اور مسلم کے شارح قاضی عیاض تک داخل ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ حافظ بیہقی کے متعلق شافعیوں کی زبان کچھ ایسا نقارہ خدا بنی کہ حنفیوں کو اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ بھی نظر نہ آتا تھا، آخر وہ کیا کرتے اسلامی ممالک کے اتنے طول وعرض میں پھیلے ہونے کے باوجود کسی طرف سے کوئی آواز جواب میں جب نہیں اٹھتی تھی تو اس کے سوا اور کیا باور کیا جاتا کہ شافعیت کا حنفیت پر یہ حملہ لاجواب ہے، بیہقی کی وفات ۴۵۸ھ یعنی پانچویں صدی کے وسط میں ہوئی، پانچویں بھی گذر گئی اور کہیں سے جہاں تک مجھے معلوم ہے حنفیوں کی طرف سے کوئی پتہ بھی نہ کھڑکا۔ چھٹی بھی گذرنے لگی اور گذرتی رہی، تا اینکہ بالآخر گذر ہی گئی، اور سناٹے کا وہی عالم ساری حنفی دنیا پر چھایا رہا، طحاوی کے قرض کے اتارنے میں شافعیوں کی طرف سے تاخیر ضرور ہوئی تھی مگر صدی پوری ہوتے ہوئے انھوں نے ایک ایک پیسہ بے باق کر دیا تھا اور یہاں ایک سے آگے بڑھ کر مسلم دوسری صدی بھی ختم ہوگئی، دوسری صدی کے بعد تیسری بھی ختم ہو رہی تھی۔ اس کے بھی اسی پچاسی سال گذر چکتے تھے لیکن حنفیوں کے جمود وسکون کی وہی حالت تھی۔ وہ تو علمائے احناف نے اپنے عام متبعین کو حدیث وفنون حدیث سے بیگانہ رکھا تھا اس لیے خیریت ہوگئی کہ بیہقی کے محدثانہ تنقیدات کا وزن عام حنفیوں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کے مولویوں کو بھی صحیح معنی کر کے محسوس نہ ہوا ورنہ اگر کہیں ان لوگوں میں بھی حدیث کا چرچا اسی شکل

میں رہتا جیسے شوافع اور حنابلہ میں ہے تو جہاں تک میرا خیال ہے ہے ان صدیوں میں خدا ہی جانتا ہے کہ حنفیوں کی کتنی آبادیاں شافعیت کے دائرہ میں داخل ہو جاتیں۔

لیکن ٹھیک جب ساتویں صدی قریب تھی کہ ختم ہو جائے، اب اسے حضرت امام ابوحنیفہ کا روحانی تصرف خیال کیجئے یا اتفاقی حادثہ سمجھئے۔ اسی مصر میں جہاں سے اس علمی معرکہ کی ابتداء ہوئی تھی حنفی علماء کا ایک خاندان جو نسلاً ماردینی یعنی کرد تھا اور اس لیے الترکمانی کی نسبت سے مشہور تھا۔ اسی خاندان سے ایک عالم علی بن عثمان بن ابراہیم الماردینی اٹھے۔ غالباً مصر میں ان کے والد عثمان ہی باہر سے تشریف لائے تھے السیوطی نے ''حسن المناظرہ'' میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

انتهت إليه رياسة الحنفية بالديار المصرية. — مصری علاقوں میں ان ہی پر حنفیوں کی ریاست منتہی ہوئی ہے۔

صاحب ''جواہر المضیہ'' ان کے شاگرد ہیں انھوں نے یہ بھی اضافہ کیا ہے:

سمع من الدمياطي و الأبرقوهي. — عثمان بن ابراہیم ماردینی الترکمانی نے دمیاطی اور ابرقوہی سے حدیث سنی تھی۔

الدمیاطی جو شافعی المذہب عالم ہیں ان کو جلال الدین سیوطی نے ''الإمام العلامۃ الحافظ الحجۃ النسابہ شیخ المحدثین'' سے ملقب کیا ہے، علاوہ ان القاب کے ان کا یہ بھی بیان کیا ہے کہ:

طلب الحديث فرحل و جمع فأوعى. — علم حدیث کی طلب میں سفر کیا پس بہت کچھ سمیٹا اور جمع کیا۔

پھر ساتویں صدی کے ایک عالم المزی① ہیں ان کا قول الدمیاطی کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ:

---

① کتاب حسن المحاضرۃ میں المزی کی بجائے المزنی کا لفظ ہے۔ (زاہد)

مارائت في الحديث أحفظ منه.① میں نے حدیث کا دمیاطی سے بڑا حافظ نہیں دیکھا۔

ابن الترکمانی عثمان کا نسلاً احناف کے خاندان سے ہونا اور مصر میں پھر دمیاطی جیسے حفاظ حدیث سے سماعت حدیث میرے خیال میں ان ہی دونوں باتوں کا نتیجہ ان کی فقہ وحدیث کی جامعیت ہے ماسوا اس کے ایک خاص چیز قابل غور یہ بھی ہے کہ ساتویں صدی کے اختتام پر حنفیوں میں ہم ایک غیر معمولی انقلاب بھی محسوس کرتے ہیں، خصوصاً مصری علماء میں میرا مطلب یہ ہے کہ احناف کے دو مشہور ماہر حدیث علامہ جمال الدین زیلعی صاحب تخریج، ہدایہ وکشاف اور حافظ مغلطائی شارح بخاری، یہ دونوں حنفی مشہور محدثین اسی صدی کی پیداوار ہیں اور عجب اتفاق ہے کہ دونوں مصری ہیں۔ اسی ماحول میں علی بن عثمان الترکمانی کی تعلیم وتربیت ہوئی۔ تعلیم تو انھوں نے والد سے پائی جو خود حدیث وفقہ کے ماجع تھے۔ فقہ کا اندازہ تو اسی سے ہوسکتا ہے کہ امام محمد کی جامع جیسی فقہ کی چیستان کے شارح ہیں اور حدیث کا حال تو گذر ہی چکا کہ الدمیاطی کے شاگرد ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ڈھائی سو سال سے حنفیوں پر جو بقایا علم حدیث سے بے پروائی برتنے کی سزا میں چلا آرہا تھا اس کی ادائیگی کے لیے قدرت نے ان ہی علامہ علاء الدین علی بن عثمان الماردینی الترکمانی کا انتخاب کیا۔ یہ اپنے وقت میں مصر کے قاضی القضاۃ تھے اور کئی پشتوں تک یہ عہدہ ان ہی کے خاندان میں رہا۔ مولانا عبدالحئ فرنگی محلی ان کے علمی مقام کے متعلق ارقام فرماتے ہیں کہ:

علاء الدين الشهير بابن التركماني كان إمام شيخا بارعا كاملا مدققا متبحر الفنون العقلية والنقلية. علامہ علاء الدین جو ابن الترکمانی کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ امام وشیخ تھے۔ عقلی ونقلی فنون میں صاحب تبحر وتدقیق تھے اور غیر معمولی درجہ کے

① حسن المحاضرۃ للسیوطی، ذکر من کان بمصر من حفاظ الحدیث، رقم الترجمۃ: ۸۰ الدمیاطی، ج:۱، ص:۳۰۵۔

صاحب کمال تھے۔

پھر اس اجمال کی تفصیل فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

لـه اليـد الـطـولـى فـي الحديث والتفسير والبـاع الـمـمـتـد فـي الفرائض والحساب والشعر والتواريخ.	حدیث وتفسیر میں بڑی زبردست دستگاہ تھی اور فرائض، حساب، شعر، تواریخ میں بھی ان کی نظر کا دائرہ وسیع تھا۔

اور یہ ایک تو حنفی عالم کی شہادت ہے۔ مشہور شافعی اور شافعی العصبیت عالم جلال الدین السیوطی کے الفاظ بھی ان کے متعلق یہ ہیں کہ:

كان إماما في الفقه والأصول والحديث.	فقہ اصول اور حدیث میں وہ امام وقت تھے۔

اگرچہ ''الحدیث'' کی امامت تسلیم کرتے ہوئے بھی ''الفقہ والاصول'' کے بعد ''الحدیث'' کے لفظ کو لانا بے معنی نہیں ہے لیکن ایک شافعی عالم کی اتنی شہادت بھی کافی ہے ابن الترکمانی کے براہ راست تلمیذ علامہ عبدالقادر مصری، جواہر مضیہ کے مصنف نے الفاظ کی ترتیب کو بدلتے ہوئے لکھا ہے کہ:

كـان إمـام فـي الـتـفسيـر والحديث والفقه والأصول والفرائض والشعر.	وہ یعنی (ابن الترکمانی) تفسیر وحدیث وفقہ واصول وفرائض وشعر میں امام تھے۔

اور میرے خیال میں ان کی علمی مناسبتوں کی صحیح ترتیب یہی ہے مگر علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی سے تعجب ہے کہ درکامنہ میں ان کا ذکر کرتے ہیں مگر بڑی مشکل سے صرف دو لفظ یعنی:

تفقه وتمهر.	فقہ حاصل کیا اور مہارت پیدا کی۔

کے سوا طبیعت زیادہ سخاوت پر آمادہ نہ ہوسکی۔ گویا حدیث کا ذکر ہی غائب ہے، حالانکہ ابن الترکمانی تقریباً پانچ چھ سو سال کے ایک علمی زنجیر کی طلائی کڑی ہیں۔ حافظ اس سے ناواقف بھی نہیں ہیں۔

بہر حال درخت کے پہچاننے کے لیے ہمیں پھل کا دیکھنا ہی کافی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ڈھائی سو سال کے بعد بیہقی نے جس مورچہ پر قاہرانہ قبضہ کر رکھا تھا علامہ ابن الترکمانی کو خدا نے اس مہم کے سر کرنے کے لیے تیار کیا اور وہ اس کے لیے آمادہ ہوئے۔ نہایت سخت رنج دہ بات ہے کہ ''جواہر مضیہ'' کے مصنف حالانکہ ان کے شاگرد ہیں لیکن بندہ خدا نے اپنی کتاب کے دس بارہ ورق متفرق طور پر اس خاندان کے مختلف افراد کے ذکر کے لیے وقف کئے، لیکن بجز رشتہ بتانے اور الامام العلامہ وغیرہ تعریفی الفاظ کے کچھ نہیں لکھا کہ غنیم کے ایسے سخت مورچہ کی طرف پیش قدمی کرنے کا ارادہ جب علامہ نے کیا تو اس وقت کیا واقعات پیش آئے۔ بس جس طرح سبھوں نے ان کی تالیفات کی فہرست دیتے ہوئے ان کی اس کتاب کا ذکر کیا ہے انھوں نے بھی چند تعریفی الفاظ کے اضافہ کے سوا اور کوئی خاص بات نہیں لکھی ہے مگر یہاں ایک دلچسپ چیز یہ ہے کہ اس معرکۃ الآراء کتاب کا تذکرہ ''جواہر مضیہ'' میں تو بایں الفاظ ہے:

ووضع على الكتاب الكبير للبيهقي كتابا نفيسا نحوا من مجلدين.① — ابن الترکمانی نے بیہقی کی کتاب کبیر کے متعلق ایک نفیس کتاب تقریباً دو جلدوں میں لکھی ہے۔

سیوطی بھی ''لہ تصانیف'' کے ذیل میں ''والرد علی البیہقي'' لکھ کر آگے نکل گئے اور اس سے بھی پر لطف طریقہ حافظ ابن حجر کا ہے کہ ان کی چند کتابوں کا نام لیتے ہوئے نہایت خاموشی کے ساتھ:

لہ من التصانیف غریب القرآن ومختصر ابن الصلاح والجوهر النقي.② — ابن الترکمانی کی تصنیفوں میں غریب القرآن ابن صلاح کی کتاب کا مختصر اور جوہر نقی ہے۔

حالانکہ ایک مؤرخ کی ذمہ داری ہونی چاہیے کہ آخر کچھ واقعہ کی طرف اشارہ کرے، صرف ''الجواہر النقي'' کے لفظ سے اب اتنا دماغ کس کا ہے جو البیہقی کے ہم قافیہ ہونے سے ادھر منتقل

① الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ، العین مع اللام، رقم الترجمۃ ۱۰۱۲۔ ج:۱، ص:۳۶۷۔

② الدرر الکامنۃ، ذکر من اسمہ علی، رقم الترجمۃ ۱۷۹، ج:۳، ص:۸۴۔

ہوجائے کہ اس کا تعلق حافظ بیہقی کی کتاب سے ہے۔ خیر ان لوگوں سے تو مجھے شکایت نہیں البتہ صاحب الجواہر المضیہ سے اُمید تھی کہ وہ کچھ روشنی ڈالیں گے مگر دو جلدوں میں ہے بہت اچھی ہے، اس کے لیے ان کی اطلاع کی ضرورت تھی اتنا تو ہر اس شخص کو معلوم ہوسکتا ہے جس کی نظر سے کتاب گذرے گی۔ اس بندہ خدا نے اپنے استاد کا کچھ حال بھی نہیں لکھا۔ صرف اتنی بات کہ میں نے ہدایہ کی حدیثوں کے متعلق جو کتاب لکھی تھی اس کا نام الکفایہ رکھا ان کے پاس لے گیا۔ چونکہ ان کی ایک کتاب کا نام بھی الکفایہ تھا اس لیے مذاق میں فرمایا کہ تم نے یہ نام تو مجھ سے چرا لیا۔ بس استاد کی اس ظرافت کے سوا اور کوئی قابل ذکر بات ان کی کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ البتہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ① نے گو ''الجوہر النقی'' کو گول مول کر دیا لیکن انھوں نے اتنا حال اور لکھا ہے کہ وہ شوال ۷۴۸ھ میں قاضی بنائے گئے اور اسی کے ساتھ اس واقعہ کے ذکر کرنے کی حافظ نے نہ معلوم کیا ضرورت محسوس کی کہ:

ونزل بخلعته إلى منزل القاضي زين العابدين البسطامي الذي كان قبله فلما راه بهت.

اور اپنے خلعت کے ساتھ وہ قاضی زین العابدین بسطامی کے گھر میں اترے جو ان سے پہلے قاضی تھے ابن الترکمانی ان کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

اس کے ساتھ ان کی تصانیف کا ذکر فرمانے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

وأشياء كثيرة لم تكمل.

اور بہت سی چیزیں ان کی ہیں جو مکمل نہ ہوسکیں۔

گویا ان کا بہت سا کام ادھورا رہ گیا آگے فرماتے ہیں کہ:

وله شعر وسط

اوسط درجہ کے اشعار بھی ان کے پائے جاتے ہیں۔

① حافظ عبدالقادر نے کتاب الجامع میں جس کو الجواہر المضیۃ کا تتمہ کہنا چاہیے، الجواہر النقی کو بہت سراہا اور کتاب کے مصنف پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ (برہان)

⑦

بہرحال جب ان بزرگوں نے کچھ نہیں ارشاد فرمایا تو علامہ علاء الدین ابن الترکمانی کے متعلق میں کہاں سے مواد لاسکتا ہوں، مجبوراً انھوں نے اپنی کتاب ''الجوہر النقی'' کے دیباچہ میں جو چند الفاظ لکھے ہیں، اسی کے نقل کرنے قناعت کرتا ہوں، حمد ونعت کے بعد فرماتے ہیں:

فهذه فوائد علقتها على السنن الكبرى للحافظ أبي بكر البيهقي رحمه الله تعالى.

یہ چند مفید باتیں ہیں، حافظ ابوبکر بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی سنن کبریٰ پر میں نے ٹانکی ہیں۔

یہاں تک تو انھوں نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ حافظ کی سنن پر کچھ فوائد آپ نے اضافہ کیے ہیں، لیکن اس کے بعد الفاظ یہ ہیں۔

أكثرها اعتراضات ومناقشات ومباحثات معه.

یہ فوائد دراصل حافظ ابوبکر بیہقی کے کلام پر اعتراضات ہیں، گرفتیں ہیں اور مباحثے ہیں۔

دیکھنے میں یہ ''فوائد علی البیہقی'' کل تین لفظوں میں ادا ہوئے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ حنفیت کا طویل وعریض رقبہ مصر سے ماوراء النہر بلکہ ہندوچین تک ڈھائی سو سال سے جس خفت کو محسوس کر رہا تھا۔ خفت کا یہ سارا بوجھ ان تین لفظوں سے اتر جاتا ہے۔ اگر واقعی بیہقی پر اعتراض کرنے گرفت کرنے اور اصل نتیجہ تک پہنچنے کے لیے بحث وتحقیق کرنے میں کوئی کامیاب ہو۔

مجھے اوروں کا حال معلوم نہیں لیکن اپنی محدود رسائی کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ یہ طریقہ احناف نہیں بلکہ ٹھیک بطریقہ شافعیہ ترکی کا مکمل ودل نشین فیصلہ کن جوابی حملہ ترکی ہی میں علامہ ماردینی ابن الترکمانی اپنی اس کتاب کے ذریعہ سے دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ شاہد مناظرات ومجادلات کے سلسلہ میں اتنی کامیابی کسی کو کم میسر آئی ہوگی۔ افسوس کہ میرے مقالہ کی محدودیت

اجازت نہیں دیتی کہ میں ماردینی کے ان اعتراضات، مناقشات، مباحثات کی مثالوں سے تشریح کروں، ورنہ دکھایا جاسکتا تھا کہ میں نے جو دعویٰ کیا ہے وہ کہاں تک حق بجانب ہے، تاہم ایک عام اور مشہور مسئلہ جس میں حنفی مذہب کا پہلو نہ صرف نقلاً بلکہ قیاساً ورایاً وعقلاً بھی بہت کمزور ہے۔ اس کا اجمالی ذکر تو کر ہی دیتا ہوں، میری مراد مسئلہ قہقہہ سے ہے کہ حنفی مذہب میں صرف مفسد صلوٰۃ ہی نہیں بلکہ ناقض وضو بھی ہے۔ عراق کے اہل الرائے کی اس سادگی پر ''حشویہ'' اور ''ظاہریہ'' تک کو حیرت ہے کہ وضو کے شکست کو قہقہہ سے کیا تعلق، مگر سب جانتے ہیں کہ اہل الرائے کے امام کی یہی رائے ہے حتیٰ کہ براہ راست امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے اس مسئلہ میں یہ اعتراف منقول ہے کہ جو قہقہہ کو ناقض وضو کہتے ہیں (یعنی ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ):

أبو شيبه ضعيف والصحيح أنه موقوف. ابوشیبہ حدیث کا راوی ضعیف ہے اور صحیح یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ حدیث منسوب نہیں ہے بلکہ موقوف ہے۔

مگر اب جو حدیثوں کے ذخیرہ پر نظر پڑی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی چیز حنفیہ کے خلاف ان کو نہ ملی، مجبوری میں کیا کرتے، بڑی مشکل سے دو صحابیوں یعنی جابر بن عبداللہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کا قول ان کو ملا۔ جس میں قہقہہ نہیں بلکہ "ضحك" کے متعلق یہ الفاظ پائے جاتے ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے (يعيد الصلاة ولا يعيد الوضوء ①) اور ابوموسیٰ اشعری سے (فليعد الصلاة) مروی ہے، ابوموسیٰ اشعری کے قول میں وضو کے عدم ذکر کو ذکر قرار دے کر بیہقی نے اس کو بھی اپنی دلیل بنالیا، زور پہنچانے کے لیے ابوامامہ باہلی کا ایک قول جس میں صراحتاً "ضحك" تک کا بھی ذکر نہیں ہے مگر ضمناً اس پر بھی اثر پڑتا تھا اس لیے اس کو بھی نقل کیا کہ:

الحدث ما كان من النصف الأسفل. حدث وہ ہے جو جسد کے نچلے حصہ سے ہو۔

① یعنی نماز لوٹائے وضو کو نہ لوٹائے۔

چونکہ قہقہہ کا تعلق نصف اعلیٰ سے ہے اس لیے جہاں خون نکلے، نکسیر پھوٹے، قے وغیرہ کے متعلق اس سے عدم نقض وضو کا حکم نکلتا ہے۔ ضحک بھی اس ضمن میں داخل ہو گیا۔ ''أصح ما في الباب'' حدیث مرفوع کو سب پر ترجیح دینے والے شوافع کی طرف سے صحابہ کے قول کے بعد پھر تابعین کے متعلق ابوالزناد کی ایسی خبر کو بھی دلیل کا رنگ دیا گیا کہ ابوالزناد کہتے تھے کہ ایسے فقہاء جن کے فتویٰ پر عمل کیا جاتا ہے مثلاً سعید بن المسیب، عروۃ قاسم بن محمد اس سب کو یہی پایا کہ:

یقولون فیمن رعف غسل عنه الدم ولم یتوضأ وفي من ضحك في الصلوة أعادها ولم یعد وضوئه.	وہ کہتے تھے کہ جس کی نکسیر پھوٹے وہ سرف خون دھولے اور دوبارہ وضو نہ کرے یوں ہی نماز، جس نے ہنس دیا ہو وہ صرف نماز کو دہرائے گا۔

یہ سارے تیر حنفیوں کے اس حدیث مرفوع کے مقابلہ میں چلائے گئے جو اس سلسلہ کے متعلق وہ پیش کرتے ہیں:

أن رجلا أعمى جاء والنبي صلى الله عليه وسلم في الصلاة فتردى في بئر فضحك طوائف من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم فأمر النبي صلى الله عليه وسلم من ضحك أن یعید الوضوء والصلاة.	ایک اندھا آدمی آیا اور نبی ﷺ نماز میں تھے، اندھا گر پڑا ایک کنویں میں، تو ہنس پڑے کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے، تب حکم دیا نبی ﷺ نے کہ جو ہنسا ہے چاہیے کہ وضو کو دوبارہ کرے اور نماز کو لوٹائے۔

حافظ بیہقی کو معلوم ہے کہ یہ حدیث معمولی لوگوں کی روایت کی ہوئی نہیں ہے بلکہ اساطین حدیث ابن شہاب زہری، حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، ابراہیم نخعی سب اس کے راوی ہیں اور جن لوگوں نے ان بزرگوں کے واسطے سے اس حدیث کو آنحضرت کی طرف منسوب کیا ہے، بیہقی یہ بھی جانتے ہیں کہ ان میں سے کسی پر جرح نہیں ہے تاہم اس پر اتر آئے کہ ان تابعین نے براہ راست آنحضرت ﷺ سے تو اس کو سنا نہیں۔ درمیان کا راوی صحابی ہے یا کوئی اور، اس شک کی وجہ سے

حدیث قابل استدلال نہ رہی اس پر اتنا اور اضافہ کیا کہ ایک شخص ابوالعالیہ بھی اس حدیث کا راوی ہے اس کے بعد اب حافظ نے یہ دو سخت جرح قائم کیں۔

① ابوالعالیہ کے متعلق یہ تصریح کر کے کہ:

سائر أحاديثه مستقيمة صالحة. ان کی ساری روایتیں صالح اور درست ہیں۔

فرماتے ہیں لیکن صرف حدیث قہقہہ کی وجہ سے یعنی

من أجل هذا الحديث تكلموا فيه. اس حدیث کی وجہ سے لوگوں نے ان کے متعلق کچھ گفتگو کی ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ ابوالعالیہ کی وجہ سے حدیث نہیں بلکہ حدیث کی وجہ سے لوگوں نے ابوالعالیہ میں چونکہ کلام کیا ہے اس لیے اس کی روایت حجت نہیں ہوسکتی۔

② رہے حسن، زہری، اور ابراہیم، حافظ بیہقی نے خم ٹھونک کر دعویٰ کر دیا کہ ان سبھوں نے ابوالعالیہ ہی سے یہ حدیث سنی ہے۔

عبدالرحمٰن ابن مہدی، امام فن رجال وحدیث سے علی بن مدینی نے پوچھا تھا کہ

(الف): ابولعالیہ کے سوا حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بھی تو اس کے راوی ہیں تو جواب میں فرمایا کہ حماد بن زید نے مجھ سے اور حماد سے حفص بن سلیمان نے بیان کیا تا کہ: ''أنا حدثت به الحسن عن حفصة عن ابی العالیة''

(ب): اور ابراہیم بھی تو راوی ہیں عبدالرحمٰن نے کہا کہ مجھ سے شریک نے کہا کہ ابو ہاشم ان سے کہتے تھے کہ ابراہیم سے ابوالعالیہ کے واسطہ سے میں نے ہی کہا تھا۔

(ج): اور زہری بھی تو راوی ہیں، عبدالرحمٰن نے کہا کہ میں نے زہری کے بھتیجے کی کتاب میں دیکھا ہے کہ زہری اس حدیث کو بواسطہ سلیمان بن ارقم ہی سے روایت کرتے ہیں اور حسن کی

روایت ابوالعالیہ سے ہے، پس زہری والی روایت بھی ابوالعالیہ کی طرف راجع ہوگئی۔

بات اگر اتنی ہی ہوتی تو معاملہ گویا ختم ہو چکا تھا لیکن بیہقی کو معلوم تھا کہ اسی حدیث کے راوی امام ابوحنیفہ خود بھی ہیں اور اس میں معبد نامی شخص اس کو حضور ﷺ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور حنفیہ اس بنیاد پر اس حدیث کو بجائے مرسل کے متصل مانتے ہیں۔ بیہقی نے روایت کو نقل کر کے جی تو چاہتا ہوگا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی پر جرح کر دیں جیسا کہ بعض شوافع نے کیا ہے لیکن اس کی ہمت نہ ہوئی اور معبد کے نام کو معبد جہنی قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

معبد هذا لا صحبة له وهو أول من تكلم في القدر بالبصره.

اس معبد کو شرف صحبت بھی حاصل نہیں بلکہ تقدیر کے مسئلہ میں پہلے جس نے گفتگو بصرہ میں شروع کی وہ یہی شخص ہے۔

ظاہر ہے کہ بیچارے علمائے احناف جن میں اکثر ابوالعالیہ کے نام سے بھی شخصی طور پر واقف نہیں، ان کے سامنے معلومات کا جب یہ دریا بہا دیا گیا کہ حسن بصری، زہری، ابراہیم سب کا قصہ ابوالعالیہ پر ختم ہوتا ہے اس کے لیے زہری کے بھتیجے کی کتاب کا حوالہ اور یوں ہی تلاش وجستجو کر کے سب کی روایات کو ابوالعالیہ پر منتہی ہونا یہ فن رجال کے وہ نکات ہیں جن کی احناف کے عام مولویوں کو کیا خبر، بیہقی کی ساری کتاب اس قسم کے معلومات سے معمور ہے۔

مگر اب فن رجال واسناد سے نہ دلچسپی رکھنے والے احناف ہی کے ایک عالم ماردینی کو دیکھئے وہ میدان میں اترتے ہیں اور حافظ بیہقی سے پوچھتے ہیں:

کیا یہ روایت معبد جیسے مشتبہ آدمی کے سوا اور کسی صحابی سے مروی نہیں؟ خصوصاً حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ جن کے ذریعہ سے امام ابوحنیفہ روایت کرتے ہیں، ماردینی اپنے ساتھ بیہقی کی کتاب ''الخلافیات'' بھی لاتے ہیں کھول کر بتاتے ہیں کہ:

"عن إسماعيل بن عياش عن عمرو ابن قيس عن الحسن (البصري) عن عمران بن حصين."

جس میں حسن بصری معبد سے نہیں، عمران بن حصین صحابی کے واسطہ سے اس کو آنحضرت ﷺ تک منسوب کرتے ہیں، یعنی ارسال کا قصہ ختم ہوا اور ابن عیاش پر کچھ شبہ ہو تو تو ہو، بجنسہٖ اسی سند سے حافظ بن عدی نے بجائے ابن عیاش کے ابن راشد کے حوالہ سے روایت کیا ہے کہ حسن بصری حضرت عمران بن حصین سے اس حدیث کو روایت کرتے ہیں۔ رہے ابن راشد تو دیکھ لیجئے ''وثقہ احمد بن حنبل وابن معین'' پھر اسی ''الخلافیات'' میں ابن عمر سے یہ روایت مروی ہے، گویا علاوہ معبد کے دو صحابی عمران بن حصین اور ابن عمر اس کے راوی ہیں اور بیہقی اس سے واقف ہیں لیکن یہاں صرف معبد جس میں اشتباہ تھا اس کو پیش فرما دیا گیا۔ پھر معبد کو معبد جہنمی کس بنیاد پر قرار دیا گیا؟ ماردینی کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ سے تین طریقہ سے یہ روایت آئی ہے اور کسی میں یہ نہیں ہے کہ معبد جہنی تھے۔

اب سنئے معبد نامی ایک ہی آدمی نہیں ہیں، حافظ ابن مندہ کی ''معرفۃ الصحابہ'' سے ماردینی نقل کرتے ہیں:

معبد بن أبي معبد وهو ابن أم معبد رأى النبي صلى الله عليه وسلم وهو صغير.

معبد بن ابی معبد جو ابن ام معبد کے نام سے مشہور ہیں۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو بچپن میں دیکھا تھا۔

اور یہ وہ مشہور ام معبد کے صاحبزادے ہیں جن کے خیمہ میں ہجرت کے وقت حضور ﷺ تشریف لے گئے اور بکری کے دودھ نکالنے کا واقعہ پیش آیا۔ ماردینی اس پر اور اضافہ کرتے ہیں کہ ابن مندہ نے تصریح کی ہے کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جس سے قہقہہ والی حدیث روایت کرتے ہیں وہ ''الحسن عن معبد بن أبي معبد عن النبي صلى الله عليه وسلم'' ہی ہیں۔ حافظ ابن مندہ نے صرف اسی پر

قناعت ہیں کی ہے بلکہ آگے فرماتے ہیں کہ:

وهو حديث مشهور عنه رواه أبو يوسف القاضي وأسد بن عمرو وغيرهما.

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مشہور حدیث ہے۔

ماردینی فرماتے ہیں:

فظهر بهذا أن معبد المذكور في هذا الحديث ليس هو الذي تكلم في القدر كما زعم البيهقي.

اس سے معلوم ہوا کہ جن معبد کا ذکر اس حدیث کی سند میں ہے وہ معبد تقدیر پر کلام کرنے والا معبد نہیں ہے جیسا کہ بیہقی کا خیال ہے۔

آگے فرماتے ہیں کہ ''الجہنی'' کا اضافہ اگر خود ہی کر دیا ہے تو خیر ورنہ اگر سند سے معلوم ہوا ہے تو پیش کرنا تھا۔

ولم يذكر ذلك بسند لينظر فيه.

کوئی سند تو اس کی بتائی نہیں ہے ورنہ اس میں دیکھا جاتا۔

اور بات اسی پر ختم نہیں کرتے پھر فرماتے ہیں کہ:

ولو سلمنا أنه الجهنى المتكلم في القدر فلا نسلم أنه لاصحبة له.

اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ تقدیر ہی پر کلام کرنے والا معبد یہ ہو تو یہ ہم نہیں مانتے کہ ان کو شرف صحبت حاصل نہ تھا۔

پھر ابن عبدالبر کی استیعاب سے نقل کرتے ہیں:

أسلم قديما وهو أحد الأربعة الذين حملوا الوية جهينة يوم الفتح.

بہت پہلے اسلام لائے اور یہ ان چار آدمیوں میں ایک ہیں جو فتح مکہ کے دن جہینہ کے جھنڈے اٹھائے ہوئے تھے۔

صرف ابن عبدالبر ہی نہیں بلکہ

قال أبو أحمد في الكنى، وابن أبي حاتم كلاهما أن له صحبة.

ابو احمد نے ''الکنیٰ'' نامی کتاب میں اور ابن ابی حاتم دونوں نے تصریح کی ہے کہ ان کو شرف صحبت حاصل تھا۔

اس کے سوا بھی انھوں نے ابن حزم، ابن عدی، امام بخاری کے حوالوں سے معبد کے متعلق اور بھی کچھ مواد فراہم کیا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ ''عدم نقض وضو بالقہقہہ'' کے متعلق شوافع کے پاس کوئی مرفوع حدیث آنحضرت ﷺ کی موجود نہیں مگر نقض وضوء کی حدیث رکھتے ہوئے انھوں نے صحابہ اور تابعین کے فتوؤں میں پناہ لی تھی، ماردینی وہاں بھی پہنچتے ہیں، پہلے ان کی سند ہی پر انھوں نے کلام کیا ہے کہ ان صحابیوں کی طرف ان فتوؤں کی نسبت ہی مشکوک ہے پھر بالفرض اگر مان بھی لیا جائے کہ یہ ان ہی کے اقوال ہیں تو اب بات صحابہ اور تابعین کے فتوؤں پر ٹھیری اس لحاظ سے سنئے۔

قال ابن حزم روينا إيجاب الوضوء من الضحك عن أبي موسى أشعري والنخعي والشعبي والثوري والأوزاعي.

ابن حزم کہتے ہیں کہ ضحک (یعنی نماز کے اندر ہنسنے) سے وضو کرنا واجب ہوتا ہے، یہ فتویٰ ابوموسیٰ اشعری، ابراہیم نخعی، ثوری، اوزاعی سے روایت کیا گیا ہے۔

چلئے آپ کے پاس صحابہ اور تابعین تبع تابعین کے اقوال ہیں تو ہمارے پاس صحابہ اور سلف کے ایک بڑے طبقہ کا فتویٰ ہے پھر ہم ایک مرفوع متصل سند کے ساتھ ''حدیث'' بھی رکھتے ہیں اور آپ اس سے محروم ہیں۔

بیہقی نے علاوہ اسنادی بھول بھلیوں کے بعض اصولی باتیں بھی پیش کی ہیں، مثلاً زہری اور حسن کا فتویٰ خود اس حدیث کے خلاف ہے اگر ان کو اس پر اعتماد ہوتا تو اس کے قائل کیوں نہ ہوتے۔

ماردینی نے پوچھا ہے کہ اس اصول کو اور جگہ بھی آپ یاد رکھیں گے یا نہیں کتے کو سور یعنی جھوٹے

کے متعلق ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا فتویٰ تین دفعہ دھونے کا ہے مگر روایت سات دفعہ کی ہے، ہم حنفیوں نے اس وقت جب عرض کیا کہ سات کی روایت پر ان کو اعتماد ہوتا تو تین دفعہ کا فتویٰ کیوں دیتے تو اس وقت بالاتفاق اس صف سے غوغا بلند ہوا کہ ہم کو حدیث سے بحث ہے راوی کی رائے سے تعلق نہیں، لیکن آج اسی کو دلیل کی شکل میں پیش فرمایا جاتا ہے، ماردینی نے یہ مان کر کہ بالفرض اس حدیث کا اتصال نہ بھی ثابت ہو اور مرسل ہی ہو، پھر بھی ابن حزم کا یہ قول پیش کیا ہے۔

كان يلزم المالكين والشافعين لشدة تواتره عن عدد من أرسله.

لیکن مالکیوں اور شافعیوں پر اس کا ماننا اس لیے لازم ہوجاتا ہے کہ جن جن لوگوں سے اس کا ارسال منقول ہے ان کی تعداد حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہے۔

پھر خود اضافہ کرتے ہیں:

ويلزم الحنابلة أيضا لأنهم يحتجون بالمرسل.

اور حنبلیوں کو بھی اس حدیث کا ماننا اس لیے لازم ضروری ہے کہ حنابلہ اصولاً مرسل حدیثوں سے استدلال واحتجاج کرتے ہیں۔

اور آخر میں ایک فیصلہ کن بات فرماتے ہیں:

وعلى تقدير أنهم لا يحتجون به فأقل أحواله أن يكون ضعيفا والحديث الضعيف عندهم مقدم على القياس الذي اعتمدوا عليه في هذه المسئلة.

اور بالفرض مان لیا جائے کہ حنابلہ مرسل سے جواز استدلال کے نہ بھی قائل ہوں تو کم از کم یہ تو ماننا پڑے گا وہ حدیث (قہقہہ والی) ضعیف حدیث سہی حنبلیوں کا مسلک تو یہ ہے کہ ضعیف حدیث کو بھی قیاس پر ترجیح دی جائے گی، اسی قیاس پر جس پر مسئلہ قہقہہ میں وہ اعتماد کر رہے ہیں۔

ایسی روایت جو تین تین صحابی عمران ابن حصین، ابن عمر، معبد سے مروی ہو، ماردینی نے پوچھا ہے

کہ اس کے متعلق صرف مشتبہ ''معبد'' ہی کے ذکر کے کیا معنی ہیں؟ رہ گئی وہ تحقیق انیق کہ حسن، زہری، ابراہیم سب ابوالعالیہ پر گھومتے ہیں۔ ماردینی نے لکھا ہے کہ یہ بھی صحیح نہیں ہے بلکہ

العجب منه كيف يقول هذا وقد تقدم أنه أخرجه هو من طريق الحسن عن عمران بن حصين.	تعجب اس شخص سے ہے یہ کیسے کہہ رہے ہیں حالانکہ گذر چکا کہ خود ان ہی حافظ بیہقی نے حسن بصری کی وہ روایت جو عمران بن حصین کے طریقہ سے مروی ہے اس میں ابوالعالیہ پر سند کا مدار نہیں۔

اسی پر اور اضافہ کرتے ہیں کہ عمران بن حصین صحابی رضی اللہ عنہ کے سوا خود بیہقی نے اس حدیث کو ابن عمر کے طریقہ سے روایت کیا ہے (اور اس میں بھی ابوالعالیہ کا قصہ نہیں ہے) باقی زہری کے متعلق ان کے بھتیجے کی شہادت یہ ہے کہ:

ابن أخي الزهري ضعيف كذا قال ابن معين رواه عنه عثمان الدارمي.	زہری کے بھائی کے لڑکے ضعیف ہیں۔ ابن معین نے عثمان دارمی سے یہ بات نقل کی ہے۔

اور ابراہیم کے متعلق شریک کا دعویٰ کہ ابوہاشم نے اس سے کہا تھا کہ میں نے ابوالعالیہ کے حوالہ سے یہ روایت ابراہیم کو سنائی تھی، سو اس شریک کا حال سنئے:

شريك هذا هو النخعي تكلموا فيه.	یہ شریک نخعی ہیں، ائمہ نقد نے ان پر بھی کلام کیا ہے۔

اور دوسروں نے نہیں خود اسی کتاب ''السنن الکبریٰ'' میں دوسری جگہ فرماتے ہیں:

شريك مختلف فيه كان يحيى القطان لايروى عنه ويضعف حديثه جدا.	شریک کے متعلق ائمہ نقد باہم مختلف ہیں، یحییٰ بن سعید القطان ان سے روایت نہیں لیتے تھے اور ان کی حدیث کی حد سے زیادہ کمزوری پر زور دیتے تھے۔

ایک اور جگہ اسی کتاب میں پھر بیہقی کہتے ہیں:

شريك لم يحتج به أكثر أهل العلم. شریک سے اکثر اہل علم استدلال نہیں کرتے اور ان کو حجت نہیں سمجھتے۔

مگر جب ہماری باری آئی تو شریک نے ابو ہاشم کی طرف جو بات منسوب کی وہ دلیل بنائی گئی۔ یہ چند باتیں موٹی موٹی ماردینی کے کلام سے خلاصہ کر کے میں نے پیش کر دی ہیں، مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ رجال کے حربہ سے جو رعب ڈالا گیا تھا کیا ماردینی کے مباحث کے بعد یہ قائم رہ سکتا ہے۔ یہ کلام تو اس حدیث کے متعلق تھا جس سے حنفیہ استدلال کرتے ہیں۔ بھلا اس میں ارسال کا نقص کون نکال سکتا ہے، اگرچہ اس بحث میں مجھے کچھ طوالت کا تو مرتکب ہونا پڑا لیکن مؤرخین نے جس درخت کے قصہ کو اجمال کے پردہ میں ڈال دیا تھا اس کے پہچاننے کے لیے چارہ ہی کیا تھا، بجز اس کے کم از کم ایک دو پھل تو اس کے پیش کیے جائیں تا کہ نمونہ صحیح طور پر کام دے سکے۔ میں نے حنفیوں کے کمزور ترین مسئلہ کا اسی لیے انتخاب کیا اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ علامہ ماردینی نے اپنی کتاب میں شافعیوں کی راہ سے اور اسی علم کے ذریعہ سے جس پر ان کو ناز ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مکتب خیال کی تائید میں کتنا بڑا کام کیا ہے۔ کہنے کو تو ان کی کتاب صرف دو جلدوں میں ہے لیکن کیفیت اور قیمت میں بیہقی کی دس جلدوں پر اس کے وزن کے کوئی زیادہ محسوس کرے خصوصاً فن رجال وسند کے متعلق تو غالباً بیجا نہ ہوگا۔

یہ بات کہ علمائے احناف جیسا کہ بار بار کہتا چلا آ رہا ہوں ''رجال وسند'' کے مسائل سے انھیں عموماً دلچسپی نہ تھی پھر اچانک ساتویں صدی ہجری میں ایک ماردینی ہی نہیں بلکہ حنفی علماء کی ایک کافی تعداد حدیث اور علم حدیث میں جو مشغول نظر آتی ہے اور اس کے بعد مدت تک مصر میں ابن ہمام قاسم بن قطوبغا اور ان جیسے اور بھی ایسے حنفی علماء پیدا ہوتے رہے جن کا تعلق حدیث اور فقہ

سے تقریباً مساوی تھا۔اس ذہنی اور ذوقی انقلاب کا واقعی سبب کیا تھا؟

بظاہر اس سلسلہ میں مجھے اب تک اور تو کوئی چیز نہیں ملی ہے بجز اس کے کہ چھٹی صدی ہجری مصر کا وہ عہد ہے جس میں بجائے کسی ایک مذہب کے چاروں مذاہب کے قضاۃ کا تقرر ہونے لگا۔ السیوطی نے ابن میسر کی تاریخ مصر سے نقل کیا ہے کہ:

في سنة خمس وعشرين وخمسمائة في الحكم أربع قضاه يحكم كل قاض بمذهبه ويورث بمذهبه.

۵۲۵ھ میں عدالت میں چار چار قاضیوں کا تقرر ہونے لگا ہر قاضی اپنے مذہب کے رو سے فیصلے کرتے تھے اور وراثت اپنے مذہب کے قاعدوں سے دلاتے تھے۔

اس بدعت کو حسنہ کہئے یا سیئہ اس سے پہلے چونکہ مصر کے قضاء پر زیادہ تر شافعیوں کا تقرر ہوتا تھا حتیٰ کہ السیوطی نے تو یہاں تک مبالغہ کیا ہے کہ:

كان متمحضا للشافعية فلايعرف أن غيرهم حكم في الديار المصرية منذ وليها أبوزرعة محمد بن عثمان الدمشقي في سنة أربع وثمانين ومائتين.

مصر کی قضائت شافعیوں کے لیے مخصوص تھی، مصری علاقوں میں اس زمانہ سے یعنی جب سے ۲۸۴ھ میں ابوزرعہ محمد بن عثمان دمشقی کا تقرر ہوا شافعی قاضیوں کے سوا فصل خصومات کے سلسلہ میں اور کسی مذہب کے قاضی کو کوئی نہیں جانتا پہچانتا تھا۔

اور مصر ہی نہیں بلکہ ان کا بیان ہے کہ:

وكذا دمشق لم يلها بعد أبي زرعة المشار إليه إلا الشافعي.①

یہی حال دمشق الشام کا بھی تھا کہ ابوزرعہ مذکور کے بعد وہاں شافعی قاضی کے سوا اور کسی کا تقرر نہیں ہوتا تھا۔

① حسن المحاضرۃ للسیوطی، باب ذکر قضاۃ مصر، ج:۲، ص:۱۵۵۔

لیکن صدیوں سے شافعیوں کے جو اجارہ ملک مصر وشام کا حاصل تھا چھٹی صدی میں ختم ہو گیا اور رفتہ رفتہ ان کا زوریوں ہی ٹوٹتا رہا حتیٰ کہ مشہور مصری سلطان الملک الظاہر بیبرس کے زمانہ میں تھوڑی بہت ترجیح جو ان لوگوں کو حاصل تھی وہ بھی ختم ہوگئی، عام طور پر شوافع پر یہ بات نہایت گراں گذری، عملا اس سلسلہ میں کیا کچھ کیا جاتا رہا ہوگا اور کیا کچھ کہا جاتا ہوگا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ تاج الدین السبکی صاحب الطبقات الشافعیۃ الکبری جیسے سنجیدہ روشن خیال عالم بھی اپنی کتاب میں یہ ارقام فرماتے ہیں کہ:

قال أهل التجربة هذه الأقاليم المصرية والشامية والحجازية متى كانت البلد فيها لغير الشافعية خربت ومتى قدم سلطانها غير أصحاب الشافعي زالت دولته سريعا.

اہل تجربہ کا بیان ہے کہ مصری وشامی وحجازی علاقوں میں جب تسلط شافعیوں کے سوا کسی اور کا ہوا تو اسی وقت ملک میں بربادی پھیل گئی ہے۔ اسی طرح ان علاقوں میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ماننے والوں کے سوا اگر کسی کو سلطانی حاصل ہوئی تو اس کی حکومت بہت جلد زوال پذیر ہو جاتی ہے۔

پھر خدا جانے کس بنیاد پر بٹوارہ کے اس نظریہ کو پیش فرماتے ہیں کہ مصر، شام، حجاز ہم شافعیوں کے لیے اس طرح مخصوص ہے کہ:

كما جعله الله لمالك في بلاد المغرب ولأبي حنيفة فيما وراء النهر.

جیسے اللہ تعالیٰ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے لیے مغربی بلاد میں اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے لیے ماوراء النہر میں قرار دیا ہے۔

اور یہ تو تاج الدین السبکی کا بیان ہے، اب ان کے والد کا خیال بھی سنئے وہ تو اپنے صاحبزادے سے اور بھی چند قدم آگے ہیں۔ تاج ہی لکھتے ہیں:

سمعت الشيخ الإمام الوالد يقول سمعت صدرالدين المرحل يقول ما جلس على كرسي مصر غير شافعي إلا وقتل سريعا.

میں نے اپنے والد (تقی الدین السبکی شافعی) سے سنا ہے فرماتے تھے کہ میں نے صدر الدین بن المرحل سے سنا وہ کہتے تھے کہ مصر کی کرسی پر جب کبھی کوئی غیر شافعی بیٹھا ہے بہت جلد قتل کر دیا گیا ہے۔

اسی سلسلہ میں شوافع میں بھی بہت کچھ مشہور تھا کہ جب ملک الظاہر بیبرس نے چار قاضیوں کے رسم کی پھر تجدید کی تو اس نے ایک دن خواب میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ غضب ناک ہو کر فرما رہے ہیں:

''تو نے میرے مذہب کے ساتھ دوسرے مذہبوں کا جوڑ لگا دیا ہے اچھا جا میں نے تجھ کو اور تیری اولاد کو مصر سے معزول کر دیا ہے۔''

لوگوں کا بیان ہے کہ اس خواب کے بعد ملک الظاہر بیبرس اس کے بعد زیادہ دن جی نہ سکا اور مر گیا اور اسی طرح اس کا بیٹا السعید بھی زیادہ دن نہ ٹھہر سکا اس کی حکومت زائل ہوگئی اور اس کا خاندان آج فقر و فاقہ کا شکار ہے۔

السبکی نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب ملک الظاہر مر گیا تو کسی نے اس کو خواب میں دیکھا پوچھا کہ تیرے ساتھ کیا گذری؟ تو جس بیچارے سے خدا جانے کتنے گناہ ہوئے ہوں گے، کس کس کا مال غلط طریقہ سے لیا ہوگا، اور جیسا کہ عموماً اس زمانہ کے سلاطین کا حال تھا خدا جانے کتنوں کے خون اس کے گردن پر ہوں گے لیکن اس تمام سلسلہ میں اس کی سزا جس چیز پر ہوئی وہ یہ تھی کہ جس کا اظہار خواب دیکھنے والے صاحب سے اس نے بایں الفاظ کیا:

عذبني الله عذابا شديدا لجعل القضاة

اللہ تعالیٰ نے میری سخت سزا اس حرکت پر فرمائی

أربعة وقال فرقت كلمة المسلمين. کہ میں نے چار چار قاضیوں کا تقرر کیا۔ فرمایا کہ تو نے مسلمانوں کی بات میں تفرقہ ڈال دیا۔

ان واقعات سے اور تو کچھ نہیں اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ برادران شوافع پر دوسرے مکاتب خیال کے علماء کا تقرر سخت ناگوار گذر رہا تھا، جب کشفی اور رویائی نظریات کا یہ حال ہے تو نسبتاً اس سے جو آسان تر چیز تھی یعنی دوسروں کے علم پر حملہ کرنا، ان کے نقائص نکالنے بھلا اس میں کیا کمی کی گئی ہوگی۔ خصوصاً حنفیوں کو حدیث کے معاملہ میں رسوا اور بدنام کرنا تو آسان ہے کہ معمولی عربی خواں بھی ہدایہ کے صفحات کو الٹ کر ہر صفحہ سے تقریباً ایسی حدیث نکال کر دکھا سکتا ہے جس کا پتہ بخاری و مسلم ہی میں نہیں صحاح کی اور دوسری کتابوں میں بھی مشکل ہی سے چلتا ہے، کیونکہ ان الفاظ کے ساتھ ہدایہ کی حدیثیں ان کتابوں میں واقعہ یہ ہے کہ نہیں پائی جاتیں۔ آج بھی ہندوستان مطبع کی ہدایہ کی تقریباً اکثر حدیثوں کے نیچے ''غریب جدا''، ''نادر جدا''، ''لم یوجد فی الکتب'' لکھا ہوا ملتا ہے۔

بظاہر اسی سوال نے میرے خیال میں مصر کے اس عہد میں اہمیت حاصل کی اور آخر کچھ لوگ حنفیوں میں تیار ہو گئے جنہوں نے پوری توجہ اور محنت سے حدیث و متعلقات حدیث کے فنون میں کمال پیدا کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہدایہ ہی اس زمانہ میں بھی یاروں کا تختۂ مشق بنی ہوئی تھی اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کہاں تو یہ حال تھا کہ ہدایہ کے شروح میں بھی حدیثوں کی تخریج کا التزام نہ تھا یا ایک وہ زمانہ مصر میں آیا کہ صرف علامہ زیلعی ہی نے نہیں بلکہ جیسا کہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے صاحب جوہر النقی علامہ ماردینی نے بھی اور ان کے شاگرد عبدالقادر مصری صاحب جواہر مضیہ نے بھی ہدایہ کی حدیثوں کی تخریج پر کام کیا اور مستقل کتابیں لکھیں۔①

① اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مصر میں شافعیت اور حنفیت کے یہ قصے جس زمانے میں چھڑے ہوئے تھے ان ہی دنوں میں ہندوستان کے ایک عالم علامہ سراج الدین الہندی کہیں سے مصر پہنچ گئے۔ خدا نے ان کو اس ملک میں بڑا

خیر اسباب کچھ ہی ہوں مگر اس سلسلہ میں ایک بڑا کام یہ ہوگیا کہ طحاوی کے جس تیر کو حافظ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے الٹ کر احناف پر چلا دیا تھا اور ڈھائی سو سال تک پھر اس تیر کو کوئی واپس نہ کر سکا تھا۔ ''الجوہر النقی'' لکھ کر صرف جواب ہی نہیں دیا گیا بلکہ کچھ اقدام بھی کیا گیا تا کہ ہر حنفی اس کتاب کو اپنے سفر و حضر میں بآسانی رکھ سکے۔ ماردینی کے کچھ دن بعد مصر کے دوسرے حنفی محدث قاسم بن قطلو بغا نے جو علاوہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے علامہ ابن الہمام حنفی صاحب ''فتح القدیر'' کے تلمیذ رشید ہیں ''الجوہر النقی'' کا ایک خلاصہ تیار کیا۔

حاجی خلیفہ ''کشف الظنون'' میں لکھتے ہیں:

ثم لخصه زين الدين قاسم بن قطلو بغا الحنفي المتوفى ٨٧٩هـ و سماه ترجيع الجوهر النقي.

یہ جوہر النقی کا ایک خلاصہ زین الدین قاسم بن قطلو بغا الحنفی نے تیار کیا جن کی وفات ۸۷۹ھ میں ہوئی اس خلاصہ کا نام انھوں نے ترجیع الجوہر النقی رکھا۔

اور اس لیے کہ مسئلہ کے ملنے میں آسانی ہو:

ورتبه على حروف المعجم.①

اس کتاب کو انھوں نے حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ مرتب کیا۔

اور یوں تیسری صدی کے وسط میں ایک شافعی عالم کی زبان سے:

والله مايجئ منك شئ.

قسم خدا کی تجھ سے کچھ نہ بن پڑے گا۔

قسم کا جو فقرہ بے اختیار زبان سے نکل گیا تھا وہ نویں صدی کے آخر تک مسلسل ٹوٹتی رہی اور مصر

اقبال وجلال عطا کیا۔ شوافع سے احناف کے چھنے ہوئے حقوق کے حاصل کرنے میں سراج ہندی نے بڑے بڑے کام کئے جن کی تفصیل درر کامنہ میں حافظ ابن حجر نے کی ہے۔ سراج ہندی نے ہدایہ کی ایک شرح توشیح نامی بھی لکھی ہے جس کی خصوصیت یہی بیان کی جاتی ہے کہ جدلی شرح ہے یعنی شافعیوں کے جواب میں ہے۔

① کشف الظنون، السنن الکبیر والصغیر، ج:۲، ص:۴۸۔

کے ایک گاؤں طحا کے ایک دہقانی نوجوان کو جو کہا گیا تھا کہ تو کچھ نہیں لاسکتا خود وہ اور اس کی بدولت وفاقا وخلافا تقریباً آٹھ ساڑھے آٹھ سو سال تک فقہ اور حدیث کی دنیا میں تحقیق وتدقیق وتجسس کا ایک طوفان برپا رہا۔ گویا ہم اکثر ''جدلیات'' کے اس سلسلہ کو کسی چارٹ یا شجرہ کی شکل میں ظاہر کرنا چاہیں تو اس کی صورت یہ ہوسکتی ہے:

مختصر المزنی	تیسری صدی
''کتاب جلیل'' قاضی بکار	تیسری صدی
مختصر طحاوی کبیر وصغیر علی ترتیب المزنی وترتیب بکار	چوتھی صدی
معرفۃ السنن والآثار فی ردالطحاوی السنن الکبری بیہقی	پانچویں صدی
الجوہر النقی علامہ ماردینی الرد علی البیہقی	ساتویں صدی
ترجیع الجوہر النقی القاسم بن قطلو بغا تلخیص الجواہر	آٹھویں صدی

اور اسی ''شجرہ علیہ'' کے ہر درجہ کو میں امام طحاوی کے ''یوم الحدیا'' کے ''تعاجیب ربنا'' کا ایک ایک ''التعجیب'' قرار دیتا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ علاوہ ائمہ مجتہدین (یعنی ابوحنیفہ، قاضی ابو یوسف، محمد بن الحسن وغیرہم) کے طبقات احناف میں بڑے بڑے علماء اور فاضل پیدا ہوتے رہے لیکن حنفی ادبیات کا وہ سلسلہ جس میں فقہیات کے ساتھ حدیث وعلم حدیث کا مستند سرمایہ شریک ہے۔ اس سلسلہ کے بانی اول حنفیوں میں امام ابوجعفر طحاوی ہی ہیں انھوں ہی نے اس کی بنیاد ڈالی اور پھر جیسا کہ یہ تفصیل میں نے بتایا آئندہ جو کچھ ہوان ہی کی راہوں سے ہوا گویا اس شاخ کے حنفیوں میں وہ امام ہیں۔

لیکن نظر تحقیق کا برا ہو، چاہا تو یہی جاتا ہے اور کہا بھی جاتا ہے کہ علم وہی ہے جو تحقیقی ہو، ورنہ تقلیدی علم، علم نہیں، معلومات کی صرف گردآوری ہے۔ مگر دنیا میں جس بیچارے نے علم کی جس

شاخ میں بھی خواہ وہ دینی ہو دنیوی، تحقیق کا قدم اٹھایا، خدا جانے یہ کیا قصہ ہے کہ اس سے عوام کا کوئی طبقہ کبھی راضی نہ رہا۔ امام طحاوی کی داستان تو بیان ہی کروں گا، امام مزنی جنہوں نے اپنی پوری عمر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے علوم کی خدمت نشر واشاعت تہذیب وتنقیح میں گذار دی حتیٰ کہ اس سلسلہ میں بیچارے کو اپنی حقیقی بھانجے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الگ ہونا پڑا، جس کا صدمہ جیسا کہ ابن عساکر کے حوالہ سے نقل کر چکا ہوں، مرنے کے بعد بھی باقی رہا لیکن وہ امام مجتہد کے شاگرد تھے، اپنی کتابوں میں بعض مسائل کے متعلق انھوں نے امام سے اختلاف بھی کیا ہے، ہزار ہا چیزوں میں اتفاق کیا لیکن چند مسائل میں اختلاف، پس یہ بھی ان کے لیے مصیبت ہوگئی، بعد کو جیسے جیسے تقلید کا رنگ جیسا کہ قاعدہ ہے گہرا ہوتا رہا بیچارے امام مزنی کا یہ جرم کہ خود اپنی رائے کیوں قائم کی، شوافع کے عام طبقہ کے لیے ناراضی کا باعث ہوا۔ زیادہ دن کے بعد نہیں بلکہ تیسری صدی کے اختتام پر شافعیوں کے مشہور عالم ابن سریج المتوفی ۳۱۶ھ جن کا ذکر بار بار آچکا ہے۔ ایک طرف تو المزنی کی کتاب کی اتنی تعریف فرماتے تھے لیکن انہی سے خطیب نے ''تاریخ بغداد'' میں یہ جملہ بھی نقل کیا ہے کہ فرماتے تھے:

يوتى يوم القيامة بالشافعي وقد تعلق بالمزني يقول رب هذا أفسد علومي فأقول مهملا يا أبا إبراهيم فإني لم أزل في إصلاح ما أفسده. ①

قیامت کے دن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ حاضر کیے جائیں گے اس حال میں کہ وہ مزنی کا دامن پکڑے فرما رہے ہیں پروردگار! اس شخص نے میرے علوم کو بگاڑ دیا، تب میں کہوں گا (یعنی قاضی سریج کہیں گے) ابوابراہیم ٹھہر جاؤ، میں ہمیشہ ان چیزوں کو درست کرتا رہتا ہوں جسے انھوں نے بگاڑا تھا۔

غالباً ابن سریج کی یہی باتیں ہیں جن کی وجہ سے ابن خلکان نے کہا ہے کہ:

① تاریخ بغداد، رقم الترجمۃ: ۱۲۳۶۰ احمد بن عمر بن سریج ابوالعباس القاضی، ج: ۵، ص: ۴۵۔

كان يفضل على جميع أصحاب الشافعي حتى المزني.①

ابن سریج کو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ماننے والوں میں سب پر فضیلت دی جاتی ہے حتیٰ کہ المزنی پر بھی۔

غالباً امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے براہ راست تلمیذ اور خلیفہ پر ایک شافعی عالم کو اس لیے ترجیح دی گئی کہ پچھلے نے بجز تقلید کے تحقیق سے کہیں کام نہیں لیا۔ خیر یہ تو شوافع کی اپنے گھر کی باتیں ہیں، ہمیں اس میں پڑنے کی کیا ضرورت؟ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جرم تحقیق میں جس طرح سب کچھ مٹا دینے کے بعد امام مزنی کو ''مفسد علوم الشافعی'' کا تحفہ برادران شوافع سے ملا، کچھ یہی کیفیت امام طحاوی کی حنفیوں میں نظر آتی ہے۔ ایک طرف مخالفوں کا تو بیچارے کے ساتھ وہ سلوک جو آپ حافظ بیہقی کی زبانی سن چکے، ان پر الزام لگایا گیا کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی پاسداری میں یہ شخص اتنا غالی ہے کہ صحیح حدیث کو ضعیف کر دیتا ہے اور ضعیف کو قوی کر دیتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''لسان المیزان'' میں مسلمہ بن قاسم اندلسی کی کتاب صلہ سے امام طحاوی کے متعلق یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ:

كان يذهب بمذهب أبي حنيفة كان شديدا العصبية فيه.②

ابوحنیفہ کے مسلک کے پیرو تھے اور ان کے مذہب کی پاسداری میں سخت متعصب تھے۔

اور یہ تو خیر نصرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی جرم کی ہلکی سزا ہے، کوئی شخص معاویہ بن احمر القرشی ہے اس کی طرف تو منسوب کر کے امام کو ایک ایسی چیز سے متہم کیا گیا ہے کہ گو حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مصلحتوں کی بنیاد پر اس مجہول الحال شخص کی روایت اپنی کتاب میں درج کر دی ہے، لیکن مجھے تو اس کو نقل کرنے میں بھی شرم آتی ہے تاہم یہ دکھانے کے لیے کہ عشق حنفیت میں امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ

---

① وفیات الاعیان لابن خلکان، رقم الترجمۃ ۲۱، ابن سریج، ج:۱، ص:۴۱۔

② لسان المیزان لابن حجر، رقم الترجمۃ: ۸۴۵، ج:۱، ص:۴۱۷۔

کو کیا کیا نہ سنایا گیا۔

نقل کرتا ہوں۔ ابن الاحمر کہتا ہے:

دخلت مصر قبل الثلاث مائة وأهل مصر يرمون الطحاوي بأمر عظيم فظيع من جهة أمور القضاء أو منجهة ما قيل أنه أفتى به أبا الجيش من أمر الخصيان.

میں مصر تیسری صدی میں پہنچا اور اہل مصر کو پایا کہ وہ طحاوی کی طرف ایک سخت بیہودہ بات قضا کے سلسلہ میں منسوب کرتے ہیں۔ یا امیر ابوالجیش کو جو فتویٰ انھوں نے خصی کیے ہوئے غلاموں کے متعلق دیا تھا۔

پہلے الزام کا مطلب تو غالباً یہ ہے کہ قضاء کے سلسلہ میں کچھ لین دین خورد برد کرتے تھے اور دوسرے الزام سے خدا جانے وہ کیا کہنا چاہتا ہے، بہرحال کچھ ہی کہنا چاہتا ہو لیکن جس وجہ سے اس نے یہ باتیں تراشی ہیں، غنیمت ہے کہ اس کا اظہار بھی اس کے بعد فرما دیا گیا ہے یعنی ان دونوں الزاموں کو بیان کرنے کے بعد ارشاد ہے کہ:

وكان يذهب مذهب أبي حنيفة رَحِمَهُ ٱللَّهُ لايرى حقا خلافه.①

طحاوی رحمۃ اللہ علیہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے پیرو تھے ان کا عقیدہ تھا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے سوا کوئی دوسرا مسلک حق نہیں ہے۔

گویا خود ہی کھول دیا کہ میں نے یہ سب جو کچھ کہا اس کی علت یہ ہے کہ وہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک پر چلتے تھے اور اس باب میں اتنے متشدد تھے کہ جو خیال ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ہوا سے وہ حق نہیں سمجھتے تھے، یعنی حق کا معیار طحاوی کے یہاں صرف یہ تھا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہو، چونکہ اس شخص کے بیان کا آخری جملہ قطعاً غلط ہے جیسا کہ یوں بھی لوگوں کو معلوم ہے، قاضی حربویہ کی مجلس میں اُنہوں نے جو کچھ فرمایا تھا وہی تغلیط کے لیے کافی ہے، نیز اس کا حال آگے بھی معلوم

① لسان المیزان لابن حجر، رقم الترجمۃ: ۸۴۵، ج:۱، ص:۴۱۷۔

ہوگا، اس سے انداز ہوسکتا ہے کہ اور بھی جو باتیں ابن احمر نے ان کی طرف منسوب کی ہیں صرف اس کی خودتراشیدہ ہیں۔ بھلا جس شخص کو ابن یونس جو ان کے معاصر اور ہم وطن ہیں شب و روز کے دیکھنے والے ہیں اور السیوطی جنہیں ابن یونس الحافظ الامام کے لقب سے ملقب کرنے کے بعد فن حدیث میں ان کی جلالت قدر کے متعلق لکھتے ہیں:

هو إمام في هذا الشان متيقظ حافظ مكثر خبير بأيام الناس.①

ابن یونس فن حدیث کے امام بیدار ہیں۔ حدیث کے حافظ ہیں اور بکثرت روایت کرنے والے ہیں نیز عام تاریخ کے متعلق بھی بڑے خبیر ہیں۔

یہی محدث ابن یونس علامہ طحاوی کے متعلق فرماتے ہیں گویا عینی شہادت دیتے ہیں کہ:

كان ثقة ثبتا فقيها عاقلا لم يخلف مثله.②

امام طحاوی بڑے ثقہ، ثبت، فقیہ اور عاقل تھے، اپنی نظیر انھوں نے اپنے بعد نہ چھوڑی۔

خود حافظ ذہبی باوجود سخت متشدد ہونے کے ''الطحاوی الامام'' کا عنوان قائم کر کے فرماتے ہیں:

الطحاوي الإمام العلامة الحافظ كان ثقة ثبتا فقيها لم يخلف بعده مثله انتهت إليه رياسة الحنفية بمصر.③

الطحاوی امام علامہ حافظ بڑے ثقہ، ثبت، فقیہ اپنے بعد اپنی نظیر نہیں چھوڑی، ان پر مصر میں حنفیوں کی سرداری ختم ہوئی ہے۔

گویا امام طحاوی کے پنجگانہ صفات یعنی ثقہ، ثبت، فقیہ، عاقل اور بے نظیر ہونے کی جو چشم دید گواہی ابن یونس نے دی تھی آخر تک بالاتفاق تمام محدثین اس کی مسلسل توثیق کرتے چلے آئے ہیں۔

اگر ابن الاحمر کے بیان میں کچھ بھی اصلیت کی جھلک لوگوں کو محسوس ہوتی تو یہ ناممکن تھا کہ بغیر کسی

① حسن المحاضرۃ للسیوطی، ذکر من کان بمصر من حفاظ الحدیث، رقم الترجمۃ: ۵۲، ج:۱، ص:۳۰۰۔

② لسان المیزان لابن حجر، رقم الترجمۃ: ۸۴۵، ج:۱، ص:۴۱۷۔

③ حسن المحاضرۃ للسیوطی، ذکر من کان بمصر من حفاظ الحدیث، رقم الترجمۃ ۴۹، ص:۲۹۹۔

تذبذب اور دغدغہ کے سلفاً عن خلف امام طحاوی کو محدثین ثقہ (یعنی) ایسا شخص جس کے کردار اور اخلاقی زندگی پر بھروسہ کیا جائے، مسلسل لکھتے چلے آتے، خصوصاً ان بزرگوں سے بھلاس کی اُمید ہوسکتی تھی جو طحاوی سے حنفیت کی وجہ سے اپنے دلوں میں اچھی خاصی گرانی بھی رکھتے ہیں۔

کس درجہ حیرت کی بات ہے کہ ابن الاحمر جیسے مجہول الحال والاسم شخص کو تو مصر میں امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ خبریں ملیں لیکن اسی زمانہ میں جس کا وہ ذکر کر رہا ہے۔ ہم ان کے حلقہ درس میں مشہور معاجم حدیث کے جامع سلیمان بن احمد بن ایوب الطبرانی، ابن الخشاب البردعی، القرطبی، شیخ الظاہریہ، عبداللہ بن علی الداودی، محمد بن ابراہیم المقری الحافظ، خود ابن یونس مصری اور الحافظ المعروف بقیدر ممنون بن حمزہ المعیدلی، احمد بن محمد بن منصور الدامغانی وغیرہم محدثین حفاظ ثقات وفقہاء کو پاتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے وقت اور اپنے اپنے مقام کا امام تھا۔ خدانخواستہ اگر ان بزرگوں کو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ میں ابن احمر کے اتہامات کا ادنی شائبہ بھی محسوس ہوتا تو جیسا کہ ان لوگوں کا عام دستور تھا قطعاً ان سے حدیث نہ سنتے۔

خیال کرنا چاہیے جو شخص ان جلیل القدر ائمہ وحفاظ کا استاد خصوصاً روایت حدیث کا استاد ہو اور جو خود بھی سلیمان بن شعیب نسائی، یونس بن عبدالاعلی جیسے بزرگوں کا حدیث میں شاگرد ہو، جن کے متعلق صاحب ''جواہر مضیہ'' لکھتے ہیں کہ:

شارك فيه مسلما. ان اساتذہ حدیث میں وہ امام مسلم (صاحب صحیح) کے ساتھی ہیں۔

اور یہی دو کیا امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ حدیث کی اتنی کثرت ہے کہ:

جمع بعضهم مشائخه في جزء. ان کے اساتذہ کے نام کو لوگوں نے ایک مستقل جزء میں جمع کیا ہے۔

بہر حال اس وقت امام طحاوی کے متعلق مجھے رجالی بحث، جرح وتعدیل کی مقصود نہیں ہے بلکہ کہنا یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ اوران کے مکتب خیال کی جنبہ داریوں میں جس شخص نے اپنی زندگی کا اکثر حصہ قربان کر دیا، پڑھا تو اسی لیے اور پڑھایا تو اسی لیے، لکھنے کا بھی حال یہ ہے کہ گوامام طحاوی نے علم کے اور شعبوں میں بھی چند بڑی کتابیں لکھی ہیں خصوصاً ان کی تاریخ کے متعلق لکھتے ہیں:

وله تاريخ كبير.①	ان کی بڑی تاریخ بھی ہے۔

بعد کے ارباب تاریخ بکثرت طحاوی کی اس تاریخ کا حوالہ دیتے ہیں اور ایک کتاب انھوں نے ''النوادر والحکایات'' کے نام سے بھی لکھی ہے۔ قاضی عیاض کے حوالہ سے لوگ نقل کرتے ہیں کہ:

النوادر والحكايات في نيف وعشرين جزء.	النوادر والحکایات تقریباً بیس جزء کی کتاب ہے۔

اسی طرح مشہور محدث ومؤرخ لغوی ابوعبید پر بھی انھوں نے انساب کے متعلق تنقید فرمائی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے گذشتہ بالا چند کتابوں کے سوا انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اور بہت کچھ لکھا ہے جس کی بڑی وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ باوجود طول عمر یعنی ۸۳ سال کی عمر پانے کے ان کے قوی کا حال آخر تک یہ رہا جیسا کہ ابن ندیم کی کتاب الفہرست کے حوالہ سے حافظ ابن حجر نے ''لسان المیزان'' میں نقل کیا ہے کہ:

قد بالغ الثمانين والسواد في لحيته أكثر من البياض.②	اَسّی (۸۰) سال عمر تک پہنچے لیکن ان کی ڈاڑھی کے سیاہ بال سفید سے زیادہ تھے۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ آخر وقت تک ان کو کام کرنے کا موقعہ ملا بقول ابن ندیم:

---

① الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ، رقم الترجمۃ: ۲۰۵، ج:۱، ص:۱۰۴۔

② لسان المیزان، رقم الترجمۃ، ۸۴۵، ج:۱، ص:۴۱۸۔

كان أوحد زمانه علما. علم میں یگانہ روزگار تھے۔

علی الخصوص حنفیہ اوران کے ائمہ کے علوم کا تو شاید نہ ان کے بعد اتنا کوئی بڑا عالم ہوا ور نہ شاید ان سے پہلے گذرا، مشہور اندلسی محدث حافظ ابوعمرو بن عبدالبر اپنی کتاب العلم میں ارقام فرماتے ہیں کہ:

كان الطحاوي أعلم الناس بسير الكوفيين وأخبارهم وفقههم مع مشاركة في جميع المذاهب من الفقهاء. ① الطحاوی کوفیوں کی سیرت اوران کے اخبار اوران کی فقہ کے سب سے بڑے عالم ہیں اوراسی کے ساتھ فقہائے اسلام کے دوسرے مکاتب خیال کے بھی وہ بڑے عالم ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ علامہ طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ذہنی اور کسبی نعمتوں کو حنفی مذہب کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ اس وقت تک اس سلسلہ میں ان کی جن کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے، میرے علم میں جن کی تعداد تقریباً بیس کے قریب ہے، کسی نہ کسی حیثیت سے بالواسطہ یا بلاواسطہ ان سے حنفی مذہب کو فائدہ پہنچا ہے۔ ''معانی الآثار''، ''مشکل الآثار'' تو خیر مطبوعہ ہیں اور ہر شخص ان کو دیکھ کر اندازہ کر سکتا ہے کہ گو بظاہر ان کے نام یا دیباچہ میں یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ ان میں حنفی مکتب خیال کی تائید کی جائے گی لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اصل مقصد ان کتابوں کا اس کے سوا اور کیا ہے اور ان ہی دو کتابوں سے ان کی کتاب ''احکام القرآن'' جو بیس جزء سے زیادہ اوراق میں ختم ہوتی ہے، اس کا بھی اندازہ ہوسکتا ہے اور یہ ''احکام القرآن'' قرآن کے متعلق ان کی دوسری املائی کتاب کے سوا ہے جس کے متعلق قاضی عیاض نے ''صحیح مسلم'' کی شرح ''اکمال'' میں لکھا ہے کہ:

له في القرآن ألف ورقة. قرآن کے متعلق ان کی ایک کتاب ہزار صفحوں پر ختم ہوئی ہے۔

① لسان المیزان، رقم الترجمۃ ۸۴۵، ج:۱، ص:۴۱۷۔

اس کے سوا جامع صغیر، جامع کبیر تو امام محمد کی کتابوں کی شروح ہی ہیں خود ان کی مختصر کبیر وصغیر براہ راست حنفی فقہ کی کتابیں۔ اسی طرح ان کی کتابیں جو شروط کے متعلق ہیں اور سمجھا جاتا ہے کہ اس باب میں ان کی کتابوں سے بہتر کتابیں آج تک نہیں لکھی گئی، ''جواہر مضیہ'' میں ہے:

وله شروط الكبير والشروط الصغير والشروط الأوسط.	شروط کبیر، شروط صغیر، شروط اوسط ان کی تین کتابیں ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان کا تعلق بھی حنفی مذہب ہی سے ہے کیونکہ اس فن سے ان کو خاص مناسبت اس لیے زیادہ تھی کہ قاضی بکار نے نصرہ میں ہلال بن یحییٰ الرائے و (تلمیذ ابی یوسف وزفر) سے خصوصیت کے ساتھ علم الشروط سیکھا تھا، عبدالقادر مصری نے قاضی بکار کے تذکرہ میں تصریح کی ہے کہ:

أخذ عنه (هلال الرائي) علم الشروط. ①	علم الشروط قاضی بکار نے ہلال رائے سے سیکھا تھا۔

خود قاضی بکار نے بھی کتاب ''المحاضر والسجلات'' اور ''کتاب الوثائق والعہود'' تصنیف کی تھی۔ امام طحاوی نے انہی سے اس فن کو سیکھا تھا۔ حافظ ابن حجر نے ''لسان المیزان'' میں طحاوی کا واقعہ ان ہی شروط ومواثیق وعہود کے متعلق نقل کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی حربویہ جیسے عالم بھی امام طحاوی کے نکات کو بآسانی سمجھ نہیں سکتے تھے، واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ جب قاضی حربویہ نے امام طحاوی کا نام ''دیوان الشہود'' میں درج کرالیا تو حسب ضرورت کبھی کبھی ادائے شہادت کے لیے ان کے اجلاس میں بھی جانا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے سامنے تحریری شہادت جو انھوں نے لکھ کر پیش کی تھی، قاضی حربویہ کے سامنے پڑھی۔ شہادت کی اس عبارت میں جن فقہی اور قانونی نکات کو امام نے ملحوظ رکھا تھا ان کے فوائد اور اثرات اور نتائج تک قاضی حربویہ کی بآسانی رسائی نہ ہوسکی۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ قاضی حربویہ نے ایک دفعہ عبارت سنی

① الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیۃ، رقم الترجمۃ: ۳۷۸ بکار بن قتیبہ، ج:۱، ص:۱۶۹۔

اور کہا کہ ''عرفنی'' مجھے سمجھاؤ، امام نے سمجھایا، پھر بھی ان کی سمجھ میں نہ آیا اور بولے ''عرفنی'' جب دو دفعہ یہ ہو چکا تو اس زمانہ چونکہ گواہوں یا مقدمہ کے فریقین کا اظہار کھڑا کر کے نہیں لیا جاتا تھا بلکہ سب قاضی کے سامنے فرش ہی پر بیٹھ جاتے تھے، اور اپنے اپنے وقت میں بیٹھے بیٹھے ہی اظہار دیتے تھے۔ اسی بنیاد پر اب تک تو امام طحاوی قاضی حربویہ کو بیٹھے بیٹھے سمجھا رہے تھے لیکن جب دو دفعہ انھوں نے ''عرفنی عرفنی'' کہا، تب امام کا ارادہ ہوا کہ اب اس عبارت کے حقائق ونکات پر تفصیلی بحث قاضی کے سامنے کرنی چاہیے، مخاطب کر کے قاضی صاحب سے بولے:

يأذن لي القاضي في القيام إلى موضع. — کیا قاضی اجازت دیں گے کہ میں کسی جگہ کھڑا ہو جاؤں۔

قاضی صاحب نے فرمایا ''قم'' یعنی کھڑے ہو کر تقریر کرنا چاہتے ہو تو کرو۔ امام طحاوی پر اپنے مضمون کو بیان کرنے کا شوق اتنا غالب تھا کہ:

فقام أبو جعفر يجر رداءه قد سقط بعضه قال فأقام في ناحية. — ابو جعفر کھڑے ہوئے اس طریقہ سے کہ اپنی چادر جس کا کچھ حصہ ان کے جسم سے گر گیا تھا اسے گھسیٹ رہے تھے اور ایک کنارہ پر کھڑے ہو گئے۔

کھڑے ہو کر اپنی شہادت کے ہر ہر لفظ پر انھوں نے اس طرح بحث کی جیسے اس زمانہ میں وکلاء اور بیرسٹر بحث کرتے ہیں۔ تقریر جب ختم ہو گئی تب بیٹھ گئے، اور اب انھوں نے دیکھا کہ قاضی حربویہ کے چہرہ پر مطلب کے سمجھ لینے اور ان دقائق تک پہنچ جانے کی علامات نمایاں ہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ امام طحاوی اپنی نشست گاہ سے سرکتے جاتے تھے اور قاضی صاحب کو کہتے جاتے تھے، جی ہاں میرا فلاں لفظ سے یہ مطلب تھا اور فلاں لفظ سے یہ مقصد تھا، حافظ ابن حجر کے الفاظ یہ ہیں کہ:

ثم عاد يحبوعلى ركبتيه وقال نعم أعزك الله أشهد بكذا وكذا.

پھر پلٹ کر وہ اپنے دونوں زانوں پر سرکتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے خدا آپ کی عزت دوبالا کرے میں یہ کہتا ہوں یہ کہتا ہوں۔

قاضی حربویہ نے تب ان کے ''شہادت نامہ'' کو اپنے ہاتھ میں لیا اور (وعلم علی شہادتہ) ان کی شہادت پر اپنے دستخط ثبت کئے، فن شروط میں امام کی مہارت کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ قاضی حربویہ کی علمی جلالت ومنزلت میں بیان کر چکا ہوں اس کو پیش نظر رکھنے کے بعد اس واقعہ کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے حافظ ابن حجر نے بھی اس واقعہ کو درج کرتے ہوئے لکھا ہے:

كان أبو جعفر الطحاوي وجيه النقد في الشروط والسجلات والشهادات.①

شروط سجلات (وثائق) اور شہادات میں ابوجعفر طحاوی کی شخصیت بہت نمایاں تھی۔

مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا فقہ اسلامی قانون کی یہ شاخ بھی دراصل حنفی مکتب فقہ کی ایک خصوصی چیز تھی اس فن پر امام نے جو کچھ لکھا ہے، حنفیوں کے اس علم کو چمکانے کے لیے لکھا، انھوں نے اپنے استاد قاضی بکار کی اتباع میں خود بھی ''المحاضر والسجلات والوصایا'' پر کتابیں لکھی ہیں ایک کتاب مواریث وفرائض میں بھی تصنیف کی، اراضی مکیہ کا کیا حکم ہے، مکہ عنوۃ فتح ہوا یا صلحا چونکہ اس میں محدثین اور فقہاء کا اختلاف ہے اس لیے آئندہ احکام میں بھی اختلافات ہوئے، امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل کتاب اس مسئلہ پر لکھی۔ جنگ کے قانون کا ایک اہم باب ''غنائم اور فے'' کی تقسیم کا ہے، اس پر بھی ان کی ایک کتاب ہے۔ عینی بن ابان جو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز شاگردوں میں ہیں لیکن انھوں نے باوجود اس کے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کی غلطیوں پر تنبیہ کرتے ہوئے ''خطاء الکتب'' ایک کتاب لکھی تھی، امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب بھی ایک مستقل تصنیف کے ذریعہ سے دیا، ظاہر ہے کہ امام طحاوی کے ان تمام علمی مجاہدات سے بلا واسطہ

① لسان المیزان، رقم الترجمۃ ۸۴۵، ج:۱، ص:۴۲۱۔

یا بالواسطہ حنفی مذہب اور حنفی مذہب کے علماء ہی کو فائدہ پہنچانا مقصود تھا، یہاں تک کہ خود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مستقل سوانح عمری لکھی۔

⑧

مگر سب کچھ کرنے دھرنے کے ساتھ ساتھ چونکہ انھوں نے علم کو رٹا نہیں تھا بلکہ پڑھا تھا، اس لیے ان کی تقلید تجہیلی نہیں بلکہ تحقیقی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کے لیے مشکل ہے کہ صد فی صد مسئلہ میں کسی ایسی ہستی کے اقوال یا نظریات پر آنکھ بند کر کے ایمان لے آئے جو نہ نبی ہو، نہ پیغمبر حتیٰ کہ پیغمبر کے صحابیوں کا بھی درجہ نہ رکھتی ہو۔ امام طحاوی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تلامذہ کا جتنا بھی احترام کرتے ہوں، اور ان کے علم پر جس حد تک بھی وہ بھروسہ کرتے ہوں تاہم انھوں نے ان بزرگوں کو رسول و پیغمبر تو نہیں مانا تھا جس کی کسی بات سے اختلاف خدا کی مرضی سے اختلاف کے ہم معنی ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی طویل الذیل تصنیفات و تالیفات میں کہیں کہیں بعض خاص مسائل میں جیسا کہ انھوں نے قاضی حربویہ کی مجلس میں علانیہ اظہار کیا تھا۔ انھوں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تلامذہ کے اختیارات اور فیصلوں سے اختلاف کیا ہے اور اختلافات بھی کسی اصولی مسئلہ میں نہیں بلکہ معمولی جزئیات میں مثلاً فقہ کی عام کتابوں میں لکھتے ہیں کہ حنفیوں کا جو عام مسئلہ ہے کہ غروب آفتاب سے پہلے اگر کوئی اسی دن کی عصر شروع کرے اور قبل اختتام نماز آفتاب ڈوب جائے تو نماز پوری کرے۔ عصر میں تو یہ کہتے ہیں لیکن بجنسہٖ یہی صورت فجر میں اگر پیش آئے یعنی شروع طلوع سے پہلے کرے اتنے میں آفتاب نکل آئے تو کہتے ہیں کہ نماز توڑ دے پوری نہ کرے۔

عصر اور فجر میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرق کیوں کیا ہے؟ فقہ کی کتابوں میں تفصیلات موجود ہیں

لیکن اسی کے ساتھ لوگ کہتے ہیں:

وادعى الطحاوي أن العصر يبطل أيضا كالفجر.①	طحاوی کا خیال ہے کہ عصر کی نماز بھی فجر کی طرح باطل ہوجاتی ہے۔

اسی طرح الشیخ الفانی جو روزہ کی صلاحیت کھو چکا ہو چونکہ قضا کرنے کا امکان تو جاتا رہا اس لیے حنفیہ کا فتویٰ ہے کہ ہر روزہ کے معاوضہ میں فدیہ ادا کرے، کہتے ہیں کہ:

قال مالك لاتجب عليه الفدية وهو قول القديم للشافعي واختاره الطحاوي.②	امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ذہب ہے کہ شیخ فانی پر فدیہ واجب نہیں ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول قدیم بھی یہی ہے اسی کو طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اختیار کیا۔

یہ مسئلہ کہ واقعی امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان مسائل میں اختلاف کیا ہے یا نہیں الگ بات ہے اور میرا ذاتی خیال ہے کہ لوگوں کو غلط فہمیاں ہوئی ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں۔ اس وقت تو مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ تحقیقی تقلید کا خمیازہ بیچارے امام طحاوی کو ان چشم بند گوش بند مقلدوں سے کیا کچھ نہ بھگتنا پڑا۔ افسوس کہ میرے پاس اس وقت فقہاء کی بڑی کتابیں نہیں ہیں ورنہ میں ان کی بجنسہٖ عبارتوں کو پیش کرتا۔ تاہم دسویں صدی کے ایک بزرگ علامہ ابن کمال پاشا ترکی ہیں۔ سلطان سلیم کے زمانہ کے مفتیوں میں ہیں۔ مولانا عبدالحئ فرنگی محلی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ:

بضاعة في الحديث مزجاة كما لايخفى على من طالع تصانيفه.③	علم حدیث میں ان کی پونجی گھٹیا درجہ کی ہے جیسا کہ اس شخص پر مخفی نہیں ہوسکتا جس نے ابن کمال پاشا کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔

لیکن باوجود اس ''بضاعۃ مزجاۃ'' کے علماء سلف پر تیر اندازی کا آپ کو خاص شوق تھا۔ اسی سلسلہ

① ردالمحتار علی الدر المختار، کتاب الصلاۃ، ج:۱، ص:۳۷۳۔

② تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، کتاب الصوم، فصل فی العوارض، ج:۲، ص:۱۹۸۔

③ الفوائد البھیۃ فی تراجم الحنفیۃ، احمد بن سلیمان الشھیر بابن کمال باشا، ص:۲۲۔

میں علامہ طحاوی کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ طحاوی کو زیادہ سے زیادہ اس کا اختیار دیا جا سکتا ہے کہ:

يقدر على الاجتهاد في المسائل اللتي لا رواية فيها ولا يقدر على مخالفة صاحب المذهب لا في الفروع ولا في الأصول.

اس کی مقدرت تو رکھتے ہیں کہ جن مسائل میں ائمہ سے کوئی روایت نہیں ہے ان میں اپنے اجتہاد سے کام لیں لیکن صاحب مذہب (ابوحنیفہ وابو یوسف وغیرہ) کی مخالفت نہیں کر سکتے نہ اصول میں نہ فروع میں۔

اور یہ تو خیر ایک حد تک غنیمت ہے جس مسئلہ میں روایت نہیں ہے اس میں تو اجتہاد کا اختیار آپ امام طحاوی کو عطا فرماتے ہیں لیکن آپ سے بھی بڑھا ہوا علماء حنفیہ میں ایک طبقہ ہے جن کے اقوال براہ راست تو مجھے نہیں ملے البتہ ''ہدایہ'' کے شارح علامہ اتقانی کے واسطہ سے صاحب ''کشف الظنون'' نے جو عبارت نقل کی ہے اس سے ان حضرات کی کرم فرمائیوں کا کچھ اندازہ ہوتا ہے حاجی خلیفہ نے لکھا ہے:

قال الاتقاني في صوم الهداية عند مسئلة قضاء المريض حين ساق بخلاف عن الطحاوي فيها رادا على المشايخ لا معنى لإنكارهم على أبي جعفر الطحاوي.

الاتقانی نے ہدایہ کے باب صوم کی شرح میں اس مقام پر جہاں مریض کے روزے کی قضا کے مسئلہ کا ذکر کیا جاتا ہے لکھا ہے یعنی جب یہ بیان کرنے لگے کہ طحاوی نے اس میں اختلاف کیا ہے، اتقانی نے ان عام حنفی علماء پر رک رکے ہوئے اس پر تنبیہ کی ہے کہ ان مولویوں نے طحاوی کا جو انکار کیا ہے اور ان پر حملے کیے ہیں وہ بالکل بے معنی ہیں۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حنفی علماء کا ایک طبقہ جسے اتقانی، المشائخ سے موسوم کرتے ہیں وہ

بیچارے ابوجعفر کو صرف اجتہاد ہی کے حق سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ سرے سے ان کا منکر ہی تھا۔ حنفی مذہب میں ان کا کوئی اعتبار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اتقانی نے اس کے بعد ان المشائخ کے فرد جرم کی معذرت کرتے ہوئے یہ اور اضافہ کیا ہے:

فإنكارهم عليه بعد تأخر زمانهم بكثير لا يجدي نفعا في ذلك لعدم بلوغهم إياه.

یہ مشائخ جن کا زمانہ طحاوی کے بہت بعد کا ہے ان کا انکار کچھ مفید نہیں اس لیے کہ طحاوی کے درجہ تک یہ نہیں پہنچے ہیں۔

کیا تماشا ہے جس امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کے لیے غریب ابوجعفر رحمۃ اللہ علیہ نے ماموں کا گھر چھوڑا، اپنا در چھوڑا، مدتوں فسطاط اور دمشق کی گلیوں کی خاک چھانتے پھرے، غیروں سے ''کان صعلوکا'' کا طعنہ سننا پڑا اِس اس لیے کہ ''کان یذهب مذهب أبي حنيفة لا يرى حقافي خلافه'' کے جرم میں بدترین تہمتوں سے اپنے زمانہ میں بھی اور شافعی مؤرخین کے ذریعہ سے آج تک متہم کیے گئے محض اسی قصور میں کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک کیوں اختیار کیا۔ برادران شوافع کا ایک طبقہ اب تک مصر ہے کہ المزنی کی پیش گوئی طحاوی کے حق میں کون کہتا ہے کہ غلط ہوئی وہ پوری ہوئی اور قطعاً پوری ہوئی اس لیے کہ:

من ترك مذهب أصحاب الحديث وأخذ بالرأي لم يفلح.

جس نے اصحاب حدیث کی روش ترک کر کے اصحاب رائے کی راہ اختیار کی ہو وہ کامیاب ہی نہیں ہوسکتا۔

مگر صرف اس جرم میں کہ چند جزئیات میں ابوجعفر نے ابوحنیفہ یا ان کے شاگردوں سے اختلاف کیوں کیا اس کی سزا میں حنفی علماء کے ایک گروہ نے طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کو کوتاہ فہم بے سمجھ حتیٰ کہ اتقانی کے بیان سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ احناف کے نقل مذاہب میں بھی بددیانت قرار دیا گیا، اتقانی کی معذرت میں ایک جزء یہ بھی ہے کہ:

لأنه موتمن لائمتهم. کیونکہ طحاوی ان کے ائمہ کے مذاہب کے نقل کرنے میں امین ہیں۔

یہ جواب خود بتا رہا ہے کہ حنفی فقہ کی جزئیات کے نقل میں بھی ان ''المشائخ'' کو طحاوی پر کچھ شک تھا یہ دوستوں کا حسن ظن ہے، حالانکہ گذر چکا کہ ایک مالکی محدث جلیل ثقہ و حجۃ ابوعمر بن عبدالبر کی طحاوی کے متعلق بصیرت کے ساتھ یہ شہادت ہے:

کان الطحاوي أعلم الناس بسير الكوفيين وأخبارهم وفقههم. کوفہ والوں کی سیرت، تاریخ اور فقہ کے سب سے بڑے جاننے والے طحاوی ہیں۔

اور اسی بنیاد پر میرا ذاتی عقیدہ یہ ہے کہ حنفی مکتب خیال کے مختلف ائمہ کے باہمی اختلافات میں سب سے زیادہ معتبر اور قابل اشاعت کتاب امام طحاوی کی کتاب ''اختلاف الروایات علی مذہب الکوفیین'' ہوسکتی ہے بشرطیکہ المشائخ کی مہربانیوں نے اس کتاب کے نسخہ کو دنیا میں باقی بھی رکھا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ جس وقت سے اتقانی کی کتاب میں مجھے المشائخ کے اس حسن سلوک کی امام طحاوی کے ساتھ خبر ہوئی تو بے ساختہ زبان پر غالب مرحوم کا یہ شعر آیا:

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے نام ونگ ہے
یہ جانتا تو ان پہ لٹاتا نہ گھر کو میں

شافعیوں کے تنگ نظر جامد مقلدوں نے تو قیامت کے میدان میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو المزنی کے دامن میں لٹکا ہوا دیکھا تھا، خدا جانے احناف کے اس طبقہ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو طحاوی کا گریبان تھامے ہوئے دیکھا کہ نہیں۔

مگر الحمدللہ علماء میں جو طبقہ ''أولی الأیدی والأبصار'' کا ہے خواہ وہ کسی مسلک سے تعلق رکھتا ہو، اس نے امام طحاوی کو ہمیشہ سراہا جن کی تھوڑی بہت تفصیل ابن یونس، حافظ ذہبی، السیوطی اور حافظ

ابوعمرو بن عبدالبر وغیرہ مختلف طریقہ کے علماء کے اقول کے ذیل میں نقل کر چکا ہوں۔
اور حنفیوں میں بھی جو ارباب تحقیق وبصیر ہیں انھوں نے بھی امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی ان جلیل خدمات کا ہمیشہ اعتراف کیا ہے جو حنفی مذہب کی نصرت وتائید کے سلسلہ میں ان کے دل ودماغ نے انجام دیئے ہیں۔ الاتقانی کا باوجود یکہ انتہائی خود پسند علماء میں شمار ہے، طاش کبری زادہ نے ان کے متعلق لکھا ہے:

كان كثير الأعجاب بنفسه. ان میں خود پسندی کا شدید جذبہ تھا۔

خود ''ہدایہ'' کی جو شرح انھوں نے لکھی ہے اس کا لمبا چوڑا نام ''غاية البيان ونادرة الاقران في آخر الزمان'' ان کی فطرت کی کافی غمازی کر رہا ہے مگر بایں ہمہ ادعا چونکہ بہرحال صاحب بصیرت وتحقیق ہیں۔ اس معذرت میں جو طحاوی کی طرف سے انہوں نے پیش کی ہے، لکھتے ہیں:

فإن شككت في أمر أبي جعفر فانظر في كتاب شرح معاني الآثار هل ترى له نظيرا في سائر المذاهب فضلا عن مذهبنا. اگر تمہیں ابوجعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کچھ شک وشبہ ہو تو ان کی کتاب شرح معانی الآثار ہی کو اٹھا کر دیکھ لو، کیا اس کی نظیر سارے مذاہب میں مل سکتی ہے چہ جائیکہ ہمارے مذہب حنفی (کی کتابوں میں)۔

ہوسکتا ہے کہ اتقانی کے اس بیان میں کچھ مبالغہ کا عنصر شریک ہو لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلامی تصنیفات متعلقہ فقہ اور حدیث میں کل کتابیں نہیں اور کل کتابوں پر ہر حیثیت سے نہیں لیکن خاص کر الآثار والحدیث کے معانی کی شرح وتنقیح کے اعتبار سے اگر اتقانی کے دعویٰ کو کوئی دھرائے تو کم از کم میرے خیال میں یہ مبالغہ نہیں بلکہ انشاء اللہ واقعہ کا اعتراف ہوگا۔
ممتاز اور سربرآوردہ ارباب تحقیق میں اگر کسی شخص پر مجھے تعجب ہے تو وہ صرف علامہ ابن تیمیہ حنبلی ہیں کہ اپنی مخصوص فکر ووسیع نظر مطالعہ کے باوجود خدا جانے ان پر کیا حال طاری تھا کہ اپنی

معروف ومشہور کتاب ''منہاج السنۃ'' میں ردشمس والی حدیث پر کلام کرتے ہوئے محض اس قصور میں کہ اس حدیث کی تحسین کرنے والوں میں منجملہ دیگرا کابر محدثین کے ایک امام طحاوی بھی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً غصہ کی حالت میں ان کے قلم سے امام طحاوی کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے ہیں:

الطحاوي ليست عادته نقد الحديث كنقد أهل العلم ولهذا روى في شرح معاني الآثار الأحاديث المختلفة وإنما رجح مايرجحه منها في الغالب من جهة القياس الذي رأه حجة ويكون أكثره مجروحا من جهة الإسناد ولايثبت فإنه لم يكن له معرفة بالإسناد كمعرفة أهل العلم به وإن كان كثير الحديث فقيها عالما.	طحاوی کی عادت حدیثوں کی تنقید میں وہ نہیں ہے جو اہل علم کا شیوہ ہے، اسی لیے شرح معانی الآثار میں وہ ان حدیثوں کو نقل کرتے ہیں جو باہم مختلف ہیں پھر ان میں ترجیح جس حدیث کو دیتے ہیں تو زیادہ تر اسی قیاس سے کام لیتے ہیں جسے اپنے نزدیک وہ حجت ودلیل خیال کرتے ہیں حالانکہ سند کے لحاظ سے وہ حدیث مجروح ہوتی ہے اور ثابت نہیں ہوسکتی، وجہ اس کی وہی ہے کہ اس شخص کو الاسناد کا علم ایسا نہیں تھا جیسا کہ اس علم کے جاننے والوں کا ہوتا ہے اگرچہ حدیث کے بڑے ذخیرہ کے عالم ہیں اور فقیہ وعالم ہیں۔

اگرچہ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عبارت ان احناف کے لیے موجب عبرت ہے جنہوں نے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا انکار کیا ہے، قطع نظر حنبلی ہونے کے جن کی زد سے امام غزالی اور شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہما جیسے جہابذہ کبار نہیں بچے ہوئے ہیں، امام طحاوی کے متعلق ان کا اتنا اعتراف بھی بسا غنیمت ہے لیکن باوجود اس کے طحاوی جیسے جلیل القدر امام حدیث کے متعلق ابن تیمیہ کا یہ کہنا کہ:

لم يكن له معرفة بالإسناد كمعرفة أهل العلم به.	الاسناد کا علم ان کا ویسا نہیں تھا جیسا اس علم کے جاننے والوں کا ہوتا ہے۔

مجھے اس شک میں ڈال دیتا ہے کہ خود حافظ ابن تیمیہ کے متعلق پوچھوں کہ:

هل له معرفة بكتب الطحاوي كمعرفة المشتغلين بكتبه.	کیا ابن تیمیہ کو بھی طحاوی کی کتابوں پر ایسا عبور حاصل تھا جیسا کہ ان لوگوں کو ہے جن کو طحاوی کی کتابوں سے اشتغال رہا ہے۔

اب اس کی توجیہ یا تو وہی کی جائے جو مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے ابن تیمیہ کی اس عبارت کو نقل فرمانے کے بعد کی ہے کہ:

قلت فيه بعض مبالغه كعادته.	ابن تیمیہ کی اس رائے میں میں کہتا ہوں کہ کچھ حصہ شریک ہے جیسا کہ مبالغہ کی ان کو عادت ہے۔

یا جیسا کہ میرا خیال ہے، معلوم یہ ہوتا ہے کہ اپنی وسعت علم ونظر پر بھروسہ کر کے ابن تیمیہ نے طحاوی کی کتابوں کا صحیح طور پر جیسا کہ چاہیے مطالعہ نہیں کیا ہے ایک سرسری نظر شرح معانی الآثار پر ڈال لینے کے بعد حافظ بیہقی کی تقلید میں ان کے قلم سے یہ الفاظ نکل گئے ہیں کیونکہ اس عبارت کے علاوہ جو میں ''معرفۃ السنن والآثار'' سے حافظ بیہقی کی نقل کر چکا ہوں، بیچ بیچ میں بھی وہ طحاوی پر چوٹ کرتے چلے گئے ہیں، مثلاً ایک مقام پر فرماتے ہیں، جسے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''لسان المیزان'' میں نقل کیا ہے۔

أن علم الحديث لم يكن من صناعته وإنما أخذ الكلمة بعد الكلمة من أهله ثم لم يحكمها.	علم حدیث (الطحاوی) کا فن نہیں ہے، ایک ایک بات انھوں نے اس فن کے علماء سے اڑائی ہے نیز اسے بھی مستحکم نہ کر سکے۔

میں جہاں تک سمجھتا ہوں، حافظ ابن تیمیہ نے بیہقی کی اسی عبارت کو لفظی ردوبدل کے ساتھ محض ان کے قول پر اعتماد کرے ہوئے اپنی کتاب میں نقل کر لیا ہے ورنہ بیہقی نے اگر طحاوی کی شان

میں یہ الفاظ لکھے ہیں تو جن کو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی نصرت میں تفرد حاصل کرنا تھا ان سے تو یہ بعید نہیں ہے اور قدرت نے ماردینی کی شکل میں ان کی کلوخ اندازی کا کافی جواب سنگ سے دلا بھی دیا۔

لیکن حافظ ابن تیمیہ تو ایک آزاد خیال عالم ہیں۔ اگر وہ خود کم از کم ''مشکل الآثار'' کا براہ راست مطالعہ فرما لیتے تو ان کو اندازہ ہو جاتا کہ اس شخص کو خدا نے اگر متون حدیث کی شرح و تطبیق، تاویل و تنقیح جو ید طولیٰ عطا فرمایا ہے جس کی نظیر واقعی محدثین میں مشکل سے مل سکتی ہے تو اسی کے ساتھ ''علم اِسناد'' میں بھی ان کا پایہ کسی سے کم نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ امام طحاوی کے دوستوں اور ہم مذہبوں نے ان کی اس لیے قدر نہ کی کہ ان کی طرح وہ حدیث سے بیگانہ رہنا نہیں چاہتے تھے اور طبقہ محدثین میں وہ اس لیے بدنام ہوئے کہ ان کے اتباع میں فقہ سے کنارہ کشی نہیں اختیار کی۔ اس جامعیت نے ان کو اور ان کی کتابوں کو دونوں طبقوں میں اس منزلت و مقام سے محروم رکھا جس کی وہ واقعی مستحق تھیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی اکثر و بیشتر کتابیں گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی ہیں ورنہ ان کی تالیفات کی فہرست میں ایک کتاب ''نقض کتاب المدلسین علی الکرابیسی'' کا بھی نام لیا جاتا ہے، ''الکرابیسی'' کا شمار امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بغدادی شاگردوں میں ہے، ابوثور اور کرابیسی دونوں ہم پلہ سمجھے جاتے تھے، اسی طرح ابوعبید جیسے حافظ آثار و احادیث کی ''کتاب الانساب'' پر بھی انھوں نے ایک تنقیدی کتاب لکھی ہے جس کا ذکر پہلے بھی میں کر چکا ہوں، مولانا عبدالحی فرنگی محلی اس کتاب کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

وله الرد على أبي عبيد في ما أخطأ في اختلاف النسب.	طحاوی کی کتاب ہے جس میں انھوں نے ابوعبید پر رد ان غلطیوں کے متعلق لکھا ہے جو نسب کے سلسلہ میں ان سے سرزد ہوئی ہیں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ جو شخص ''المدلسین'' کے متعلق اور ''الانساب'' پر تنقیدی کتاب لکھے، اس کے متعلق حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ:

لم یکن له معرفة الإسناد. الاسناد کا علم اس کے پاس نہ تھا۔

کاش! مقالہ کی طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ان کی صرف دو کتابوں شرح ''معانی الآثار'' اور ''مشکل الآثار'' سے علم الاسناد کے متعلق ان نکات اور حقائق کو جمع کرتا اور حافظ ابن تیمیہ کا اس علم میں جو مبلغ ہے دونوں کا مقابلہ کر کے بتاتا، لیکن میرے مقالہ کا پہلا باب ہی اتنا طویل ہو چکا ہے کہ اس سلسلہ میں اب اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں پاتا۔ خیال تھا کہ دوسرے باب میں امام طحاوی کے خصوصی نظریات اور حدیثوں کے متعلق جو ان کے اختصاصی اجتہادات ہیں ان سب کو ایک جگہ جمع کر کے اس مقالہ کا اسے دوسرا باب قرار دوں کیونکہ باب اول کے متعلق شروع میں مجھے صرف اس کی توقع تھی کہ میں پچیس وقر میں اس کے مباحث ختم ہو جائیں گے، عام کتابوں میں جو مواد امام طحاوی کے متعلق پایا جاتا تھا ان کو دیکھ کر ابتداء میں یہی رائے قائم ہو سکتی تھی لیکن جب تلاش وجستجو کا سلسہ جاری ہوا تو چیز کے بعد چیز ملتی گئی، دلچسپ چیزیں تھیں کسی چیز کے چھوڑنے پر دل آمادہ نہ ہوا، تا اینکہ امام طحاوی کی سیرت پر یہ چھوٹا سا ایک رسالہ ہی تیار ہو گیا، اسی لیے اب یہ قصد ہے کہ دوسرے باب کا خیال ہی ترک کر دوں۔